شرق مرے شمال میں

(شعری مجموعہ)

ذوالفقار عادلؔ

شہرزاد
SCHEHERZADE

جملہ حقوق بحقِ شاعر محفوظ ہیں

ذوالفقار عادلؔ
مکان نمبر 24، گلی نمبر 1
اندرون ریلوے گیٹ، شجاع آباد
Ph: 0345-8131278
0310-1143380
zeeaadil@gmail.com

کتاب کا نام	:	شرق مرے شمال میں
شاعر	:	ذوالفقار عادلؔ
سرورق	:	زینی سعید
انتخاب	:	ادریس بابر، شاہین عباس، کاشف حسین غائرؔ
ترتیب	:	کاشف حسین غائر، وقار احسن، سلمیٰ ذوالفقار
کمپوزنگ	:	محمد اکرم کمبوہ
اشاعت	:	جولائی ۲۰۱۵ء
قیمت	:	دوسو پچاس روپے

ناشر
بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
info@scheherzade.com

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

میرؔ

ایک عشرہ، ذوالفقار عادل کے لیے

اضافی پرندوں ، درختوں کا نام و نشاں تک نہ ہوگا
یہاں عشق ہوگا جو محدود سائیں، میاں تک نہ ہوگا
الاؤ یہ بارش میں روشن رہے گا، دھواں تک نہ ہوگا

غزل کی کہانی اب اپنی روانی سے آگے چلی ہے
یہاں شاعری،زندگی، زندگی،شاعری کی جگہ لے چلی ہے

پُرانے دُھرانے سب اپنی جگہ پر سخن ساز ہوں گے
یہاں سے نئی ہر روایت جنم لے گی، در باز ہوں گے
وہ در جو وجود اور عدم نامی دیواروں کے راز ہوں گے

محبت کا جذبہ نمودار جینے کی خواہش سے ہوگا
کہانی کا آغاز، میں جانتا تھا کہ بارش سے ہوگا

ادریس بابر

اک دریا، اک درویش

(انتساب)

نانا بشیر احمد کے کتبے پر

ایک سفر میں سارا عالم اور فنا در پیش
جن کا کام محبت، باقی اُن کے نام ہمیش
ایک دعا سے کِھل سکتے ہیں یہاں ہزاروں پھول
اِس مٹی کے نیچے ہے اک دریا، اک درویش

نانی اماں کی یاد میں

سورج مُکھی کا پھول تھا دِل، تازہ تم سے تھا
دنیا میں شرق و غرب کا اندازہ، تم سے تھا
ترتیب میں یہ گھر تھا، توازن میں نظم تھی
دیوار تم سے تھی، کہیں دروازہ تم سے تھا

دادا حسن محمد کے انتقال پر

دھوپ دیکھی ہی نہیں تھی، بارشوں کا ڈر نہ تھا
آج سب دیکھا ہے جب اک سائباں سر پر نہ تھا

چچا ولایت علی کے کتبے پر

عشق ہی منصب ہے تیرا، عشق ہی تیرا نصاب
تُو کہ ہر عاشق کا عاشق، تُو کہ سب خوابوں کا خواب

جس میں تُو سویا ہے، سب اُس خاک کی اشکال ہیں
کیسا بچپن، کیا لڑکپن، کیسی پیری، کیا شباب

ایک نادیدہ سفر اور ایک گُم گشتہ جہاں
ایک پوشیدہ نظر اور ایک طرزِ انتخاب

''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے''
تجھ پہ ہو آسان و ارزاں سختیِ یومِ حساب

ابّو جی

(والدِ محترم راوٗ شوکت علی کی نذر)

میں کہ نام و نشان ہوں اُس کا
میرا مسکن، مرا پتا ہے وہ
اُس کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
میری آنکھوں میں دیکھتا ہے وہ

اُس کا سایہ ہے روشنی میری
میرا پرتَو ہے آئنہ اُس کا
وہ مرا اوّلیں زمانہ ہے
میں ہوں اِک وقت بعد کا، اُس کا

اپنے گزرے ہوئے زمانے کو
میرے اندر ٹٹولتا ہے وہ
اُس کا سامان باندھتا ہوں میں
میرا سامان کھولتا ہے وہ

امّی

(والدہ محترمہ کی نذر)

دنیا کی
سب سے خوبصورت چیز
میری ماں کی ہنسی ہے
اِس میں
چاروں سمتیں
اور
تینوں زمانے
موجود ہیں

فہرست

وہی تریسٹھ سال (عقیدت)........................ ۱۳

حمد باری تعالیٰ.. ۱۵

نعتِ رسول مقبولؐ.. ۱۶

نعتِ رسول مقبولؐ.. ۱۷

سلام بحضور امامِ عالی مقامؑ ۱۸

دِل میں جو ایک بات ہے (مضامین) ۱۹

ذوالفقار عادل......آج کا شاعر ۲۱

افسانہ طراز شاعر: ذوالفقار عادل ۲۵

دیوار اور میں (غزلیں)................................. ۳۱

پیڑوں سے بات چیت ذرا کر رہے ہیں ہم ۳۳

شب میں دن کا بوجھ اٹھایا، دن میں شب بیداری کی ۳۵

کیا توقع کرے کوئی ہم سے ۳۷

عمریں گزار کر یہاں، پیڑوں کی دیکھ بھال میں ۳۹

یہ میز، یہ کتاب، یہ دیوار اور میں............................. ۴۱

اب اسے عیب سمجھ لیجیے، خوبی کہیے ۴۳

جانے ہم یہ کن گلیوں میں خاک اُڑا کر آجاتے ہیں.................. ۴۴

چرچ کی سیڑھیاں، وائلن پر کوئی دُھن بجاتا ہوا ۴۶
کس کو سمجھائیں کہ حضرت سمجھو ۴۸
نہیں کہ مشتِ خاک ہوں، نہیں کہ خاک داں ہوں میں ۴۹
میں جہاں تھا وہیں رہ گیا، معذرت ۵۱
شُکر کیا ہے اِن پیڑوں نے، صبر کی عادت ڈالی ہے................ ۵۳
تجھ میں پڑا ہُوا ہوں میں، پھر بھی جُدا سمجھ مجھے ۵۵
وہ بوڑھا اِک خواب ہے اور اِک خواب میں آتا رہتا ہے ۵۷
یہ راستے میں جو شب کھڑی ہے، ہٹا رہا ہوں، معاف کرنا ۵۹
کچھ بھی وہاں بچا نہیں ۶۰
کبھی خوشبو، کبھی آواز بن جانا پڑے گا ۶۲
اِک دن میں چھُپا ہُوا دِن، اِک شب میں کٹی ہوئی شب ۶۴
آخری شب ہوں، شہرزاد ۶۶
سارا باغ اُلجھ جاتا ہے ایسی بے ترتیبی سے ۶۸
پکارے جا رہا ہوں، کیا کوئی ہے؟ ۶۹
نکلا ہوں شہرِ خواب سے، ایسے عجیب حال میں........................ ۷۱
رات گزری، نہ کم ستارے ہوئے ۷۳
وہ مرے غم سے آشنا ہو جائے ۷۴
رُوپ بدل کر جانے کِس پل، کیا بن جائے، مائے نی................ ۷۵
ویرانے کو وحشت زندہ رکھتی ہے.. ۷۷
مجھ کو یہ وقت، وقت کو میں، کھو کے خوش ہُوا ۷۸
سو لینے دو، اپنا اپنا کام کرو، چپ ہو جاؤ........................ ۷۹
اپنی نہ کہوں تو کیا کروں میں ۸۱
ہنسا اور پھر رو دیا بادشہ ۸۲
رات میں دن ملایئے ۸۴

دل کی آواز سماعت کرلی ۸۵
کچھ خاک سے ہے کام، کچھ اِس خاک داں سے ہے................. ۸۷
اشک گرتے نہیں ہیں یوں شاید ۸۸
سبھی کو دشت سے دریا، جدا دکھائی دیا........................... ۹۰
گرد کوزوں سے ہٹانے کے لیے آتا ہے ۹۱
دل میں رہتا ہے کوئی، دل ہی کی خاطر خاموش..................... ۹۳
اندروں سے مکالمہ کیجے... ۹۴
اشک گرنے کی صدا آئی ہے ۹۶
وقت گزرا ہوا مِلا ہے مجھے ۹۸
سفر پہ جیسے کوئی گھر سے ہو کے جاتا ہے........................... ۱۰۰
سنتے ہیں جو ہم دشت میں پانی کی کہانی............................ ۱۰۱
صحراؤں کے دوست تھے ہم، خود آرائی سے ختم ہوئے ۱۰۲
رُک گیا تھا میں کسی تحریک سے..................................... ۱۰۳
دیکھنے والوں کو پہچانیں، اُن کے ساتھ رہیں.......................... ۱۰۴
کسی کا خواب، کسی کا قیاس ہے دنیا ۱۰۵
وہ شہر، کسی شہر میں محدود نہیں تھا ۱۰۶
جانے کیا کیا ہے ترے میرے بیچ...................................... ۱۰۷
اِک نفس، نابود سے باہر ذرا رہتا ہوں میں ۱۰۸
کھنڈر ہوتے ہوئے گھر کی نشانی....................................... ۱۰۹
ہم جانا چاہتے تھے جدھر بھی، نہیں گئے ۱۱۰
کچھ نظر آتا نہیں افلاک پر... ۱۱۱
ہمیں یونہی نہ سرِ آب و ِگل بنایا جائے ۱۱۲
اے شہرِ خواب! اور بھی کچھ ہے یہاں کہ بس ۱۱۳
ترکِ دنیا بھی نہیں کرسکتے... ۱۱۴

کوزہ گر! تیرے نہ چھونے سے یہی خاک کا ڈھیر ۱۱۵
ہوئی آغاز پھولوں کی کہانی ۱۱۶
شب بھر، یہ ہم تھے اور وہ ماہِ تمام تھا ۱۱۷
وہ کہیں تھا کہ نہ تھا، فرض کریں ۱۱۸
ترے ادراک سے پہلے کہاں تھا ۱۱۹
یوں جو پلکوں کو مِلا کر نہیں دیکھا جاتا ۱۲۰
پھر کیوں واپس لوٹ گئے ہیں، گھر کو آتے آتے ہم ۱۲۱
تم مرا خواب تھے، خیال آیا ۱۲۲
شاخِ دل، اب بھی ہری ہو جیسے ۱۲۳
جتنا آب و دانہ ہے ۱۲۴
زوالِ آفتاب دیکھیے ۱۲۵
اپنی چھت پر اُداس بیٹھا ہوں ۱۲۶
اپنی پہچان بھول جاتے ہیں ۱۲۷
ہمارا خاک ہو جانا بظاہر ۱۲۸
اندر سے بھلا دیا گیا ہوں ۱۲۹
تو نہیں ہے تو دوست کیا غم ہے ۱۳۰
شجاع آباد ۱۳۱
ناموجود کی دُھن میں (فرد فرد) ۱۳۳
بارش ہونے والی ہے (مضامین) ۱۴۳
ریاضتوں کے ہولناک سناٹے میں ۱۴۵
ذوالفقار عادل ___ ایک ہمہ جہت شخصیت ۱۴۷
گھور رہا ہوں تالے کو!! ۱۴۹
م۔محبت، ک۔کہانی ۱۵۳

وہی تریسٹھ سال

(حمد، نعت، سلام)

یہ وقت وہ ہے کہ جو بار بار آتا ہے
گزرتے رہتے ہیں دِل سے وہی تریسٹھ سال

اُس نے ہمارے سامنے رکھ دی کتابِ حق
اپنی حدوں میں لوٹ گئے فلسفے تمام

میں ظلمتوں میں تھا کہ اُجالا بکھر گیا
میں راستوں میں تھا کہ ہوئے راستے تمام

حمد باری تعالیٰ

راستہ کوئی اگر ہے، تو دِکھا سکتا ہے
گر نہیں ہے، تو وہی ہے، جو بنا سکتا ہے

اپنی جانوں پہ بڑا ظلم کِیا ہے ہم نے
اب خسارے سے ہمیں تُو ہی بچا سکتا ہے

ہم تو وہ ہیں کہ جو ذرّوں کو ستارے سمجھیں
کون اِس دشت کی تاریخ بتا سکتا ہے

یہ ہنر صرف اُسی کا ہے، وگرنہ صاحب!
سونے والوں کو بھلا کون جگا سکتا ہے

کب سے بیکار پڑا ہے یہ مرا دل، عادلؔ
وہ جو چاہے تو اِسے کام میں لا سکتا ہے

نعتِ رسول مقبولؐ

دنیا کی بنیادیں رکھنے والا شخص
دُور کہیں، اِک غار میں بیٹھا، تنہا شخص

سب تاریخیں اُس میں گم ہو جاتی ہیں
دنیا کی تاریخ میں ہے اِک ایسا شخص

پہلے کے اور بعد کے سب قانون حذف
آخری خطبہ دینے والا پہلا شخص

دل جو اب تک زندہ ہے، تو حیرت کیا
دل میں ہے، اک زندہ رہنے والا شخص

تھک کر رُک جاؤں تو آنکھوں کے آگے
آ جاتا ہے پھر اِک ہجرت کرتا شخص

نعتِ رسول مقبولؐ

اور اِس سے قبل کہ حرفِ یقیں گماں ہوجائے
تری نظر کی طلب ہے، اگر یہاں ہوجائے

یہ وہ کمال نہیں ہے، زوال ہو جس کو
یہ وہ چراغ نہیں ہے کہ جو دھواں ہوجائے

یہ میرا دل ہے، گلستاں بھی اِس میں، صحرا بھی
یہ تیری بارشِ رحمت پہ ہے، جہاں ہوجائے

یہ جسم، نام و نسب کو اٹھائے پھرتا ہے
کمال ہو، ترے قدموں میں بے نشاں ہوجائے

یہ ایک تار مری دسترس میں باقی ہے
گر اُس نگاہ کی وسعت سے بادباں ہوجائے

بحال رکھ مجھے اِس چاک پر، مرے خالق!
یہی نہ ہو کہ مری خاک رائیگاں ہوجائے

سلام بحضور امامِ عالی مقامؑ

اِک اُس کے نہ ہونے سے کچھ بھی نہیں بچتا ہے
وحشت ہے کہ حسرت ہے، صحرا ہے کہ دریا ہے

دنیا کی حکومت سے، دنیا تو نہیں ملتی
مالک ہے وہ دنیا کا، جو تارکِ دنیا ہے

تاریخ ہے اِک حصّہ، اُس ذاتِ گرامی کا
باقی ہے یہاں جو کچھ، تاریخ کا حصّہ ہے

کل کس کو خبر، ہم سے، یہ کام بھی چھن جائے
اے درد، غنیمت ہے، جو مہلتِ گریہ ہے

دِل میں جو ایک بات ہے

(مضامین)

شاہد ندیم

سائرہ غلام نبی

بات اُس کم سخن کی کرتے ہیں
چِھن نہ جائے سخن وری ہم سے

تم مجھے کچھ بھی سمجھ سکتے ہو
کچھ نہیں ہوں تو غنیمت سمجھو

ذوالفقار عادل......آج کا شاعر

ذوالفقار عادل ایک مجموعۂ اضداد ہے اور اُس کی شاعری اِن تضادات کا منہ بولتا ثبوت۔ یوں تو یہ کائنات ہی تضادات کا گورکھ دھندا ہے اور اشرف المخلوقات، اشرف التّضادات۔ عہدِ حاضر میں یہ تضادات نہایت نمایاں اور گھمبیر صورت اختیار کر چکے ہیں۔ خواہ یہ تضاد انسانی نفسیات میں ہو یا سماجی اور سیاسی منظر نامے میں اور خواہ انسانی جذبوں کے ہر لمحہ تیزی سے بدلتی اور بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی سے ٹکراؤ میں۔ عادل، آج کا شاعر ہے، جس میں گزرے زمانوں کا درد اور رومان بھی موجود ہے اور جدید دور کی مغائرت اور اداسی بھی۔ اُس کی شاعری میں اَن کہی کے کہہ دینے کی تمنا بھی ہے اور ادھورے خوابوں کی تکمیل کی شدید خواہش بھی۔

خوابوں کو وقت دیجئے
نیند میں مسکرائیے

یا پھر

''اِک کمرا سایوں سے بھرا ہے، اِک کمرا آوازوں سے''
آنگن میں کچھ خواب پڑے ہیں، ویسے یہ گھر خالی ہے

اُس کے شعروں میں کہیں دلدل میں پھول کھلتے ہیں، تو کہیں کانوں کو پھاڑ دینے والی خاموشی۔

چیونٹیاں رینگ رہی ہیں کہیں اندر عادلؔ
ہم ہیں دیوار کے مانند بظاہر خاموش

کہیں وہ حیرت زدہ بچہ ہے، جو گیند کو دِل میں چھپائے ہوئے ہے اور کہیں وہ ایک ایسا بوڑھا ہے، جس کے سر پر اَن دیکھا پنچھی منڈلاتا ہے، جِسے اُس کی حیرت زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اُس کی شعری دنیا میں مقفّل گھروں کی دیواریں آپس میں باتیں کرتی ہیں اور خود کلامی کی حدیں کلیمی سے جاملتی ہیں۔

عادل کی شخصیت کی طرح اس کی شاعری میں بھی تہذیب اور شائستگی پوری آب و تاب سے چمکتی ہے۔ روایتی لب ولہجہ، الفاظ اور تراکیب میں نفاست اور نزاکت، مزاج میں غرور اور بانکپن، مضامین میں شکستِ آرزو اور بے وفائی کا غلبہ۔ ایک ایسا شخص جِسے کارواں پیچھے چھوڑ گیا ہے، مگر اُس کی اَنا اُسے یہ موقع بھی نہیں دیتی کہ وہ اہلِ کارواں کو پکار کر اپنے پیچھے رہ جانے کا احساس دِلا سکے۔

بھلا ہُوا کہ قافلے مری تلاش میں نہ تھے
پکارنا نہیں پڑا کہ صاحبو! یہاں ہوں میں

مگر اِس شائستہ اور روایتی پیراہن کے اندر ایک جدید، سماجی شعور سے بہرہ مند اور حسّاس انسان موجود ہے۔

ناٹک کے کرداروں میں کچھ سچّے ہیں، کچھ جھوٹے ہیں
پردے کے پیچھے کوئی اِن کو سمجھاتا رہتا ہے
ساری آوازوں کا مخزن، چوراہے کا شور
لمحہ لمحہ بھیس بدلتا وقت، ازل کا چور

عادل کی شاعری کا ایک اہم پہلو اُس کا تذبذب ہے، وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان، موجود اور نا موجود، ہنسنے اور رونے، خوف اور بے خوفی، خواب اور بیداری کے بیچ ششدر کھڑا ہے۔ وہ ہجوم میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے، گھر اور دفتر کی روٹین کو توڑنا چاہتا

ہے مگر نا مانوس منزلوں کی جانب سفر کرنے سے ڈرتا بھی ہے۔

ہم جانا چاہتے تھے جدھر بھی، نہیں گئے
اور انتہا تو یہ ہے کہ گھر بھی نہیں گئے

یہ تذبذب اس کے اندر ایک اضطراب، ایک فرسٹریشن کو جنم دیتا ہے۔ یہ بے چینی اور ادھورا پن، خوش گمانی اور آئیڈیل ازم کی ہموار سطح میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔

ہم تو جلتے بھی نہیں ہیں عادلؔ
اور سایہ بھی نہیں کر سکتے

یہ کشمکش کہیں معذرت خواہانہ رنگ اختیار کرتی ہے۔ ''میں اِس گلی سے نہ آ رہا ہوں، نہ جا رہا ہوں، معاف کرنا''، اور ''جو کیا، وہ نہیں ہو سکا، معذرت''۔ اور کہیں یہ احساس اُسے اندر ہی اندر جلاتا ہے۔

چیخ نہیں سکا کبھی، آگ نہیں لگا سکا
جلتا رہا ہوں رات دن، آتشِ اعتدال میں

یہ تضاد اور ہچکچاہٹ، اداسی اور تنہائی کی شکل بھی اختیار کرتی ہے۔

جتنی گہرائی ہے عادل، اُتنی ہی تنہائی ہے
بس کہ سطحِ زندگی پر تیرتا رہتا ہوں میں

مگر کہیں اِس کا اظہار، امید اور جوش کی صورت میں بھی ہوتا ہے:

بستی میں جب چاک گریباں گریہ کرتے پھرتے ہیں
اُس موسم میں ایک رفو گر ہنستا گاتا رہتا ہے

نامانوس دُھنوں میں ساز بجانے والے، ناموجود کے متلاشی کو بالآخر ''شجاع آباد'' میں اِن تضادات کا ارتکاز نظر آتا ہے۔ مجموعے کے آخر کی یہ ''نامکمل نظم''، ایک لحاظ سے عادل کے سفر کی تکمیل ہے۔ یہاں اپنی بستی سے لگاؤ اور بستی والوں سے پیار بھی جھلکتا ہے اور قدیم اور جدید کا خوبصورت امتزاج بھی ملتا ہے۔ یہاں ریل گاڑی کی تیز روی بھی ہے اور یکّہ

بانوں کی سُست رفتاری بھی۔ ٹھیلے والے کا سودا، استادوں کی تدریسی سرگرمی، وکیلوں کا کورٹ، کچہری کا کھیل اور چوراہے کا نہ ختم ہونے والا شور۔ شاعر بڑی محبت اور مہارت سے اِس منظر کی تصویر کشی کرتا ہے، مگر اِس کے ساتھ ساتھ وہ گزرے وقتوں اور اگلی پچھلی صدیوں کا عکس بھی دیکھتا ہے۔ یہاں موجود، ناموجود سے گلے ملتا ہے اور ماضی، حال سے۔

اسٹیشن پر آتی جاتی گاڑی کی آواز
جیسے اگلی پچھلی، ساری صدیوں کی ہمراز
ٹوٹی پھوٹی اونچی نیچی ناہموار سڑک
گزرے وقت کی گرد پڑی ہے جس پر دُور تلک

اسٹیشن سے گزرنے والی گاڑی کی پٹریوں کی طرح عادل کی شاعری میں بھی قدیم اور جدید، خواب اور حقیقت الگ الگ بھی ہیں مگر ان کا ہمیشہ کا ساتھ بھی ہے، وہ مل کر گاڑی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ تضاد اور تذبذب خیال کے گھوڑے کے لیے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔

عادل ہمارے دور کا شاعر ہے اور ہمارے دور کے تضادات، داخلی اور خارجی بحرانوں اور خوابوں کا عکاس۔ یہ مجموعہ اُردو شاعری میں ایک مانوس مگر مختلف اور تازہ آواز کا خوش آئند اضافہ ہے۔

شاہد ندیم

نومبر ۲۰۱۴ء

افسانہ طراز شاعر : ذوالفقار عادل

شعر وسخن کا مسافر، ذوالفقار عادل کی شعری عملداری میں پہلا قدم ،یوں تو بہت سہولت سے رکھ دیتا ہے۔ سرسری نظر میں خاموشی سے آراستہ فضا دھیرے سے استقبال کرتی ہے۔ چپ سادھے ہَوا کی سمت نمائی میں چند قدم آگے بڑھاتا ہے۔ آنکھ جیسے ہی نظارگی سے مانوس ہوتی ہے، شب کے راستے سے ایک شہرِ خواب اُس کا منتظر ملتا ہے۔ وفورِشوق میں اُدھر جانے کا ارادہ کرتا ہے کہ رستے کو جنم دینے والی شاہراہ کسی نامعلوم منزل کی سوچ میں گم صم نظر آتی ہے۔

قدم وہیں ٹھہر سے جاتے ہیں، اپنے اطراف میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ ہوا میں رچی بسی خاموشی دِھیرے سے وجود سے لپٹ جاتی ہے۔ موسموں کے تیور سے آشنا ہونا چاہتا ہے کہ صابر درختوں کی اَن کہی، پرندوں کی زبانی کُرلانے لگتی ہے۔

سکوت بھری حیرانی اُسے ایک ایسی گلی میں لے جاتی ہے، جہاں اُداس گھروں کی سب دیواریں سر جوڑے سرگوشیوں میں محو، آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی روادار نظر نہیں آتیں۔۔ لمحہ لمحہ کر کے وقت گزارا جاتا ہے اور سورج کا دن بھر کا سفر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ شام ڈھلے دروازوں کے قفل کھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ دیواروں کی سرگوشیاں آواز نما ہو جاتی ہیں اور موجود ناموجود، ازل و ابد، آغاز وانجام قسم کے سوالوں سے بھری آوازوں کی بھیڑ سی لگ جاتی ہے۔ کسی ویران سرا میں تبدیل ہوتا وجود اِس بھیڑ میں تنہا ہو جاتا ہے۔ اندر باہر جیسے خالی پن در آتا ہے۔ بے سروسامانی سے اُکتا کر، روح کی پکار، ذات کا حصار توڑتی، انجانی

سی دُھن پہ بے نیازانہ رقص کرتی اِن آوازوں پر غالب آنے لگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر گزرتی ہے کہ یہ سب آوازیں ایک الوہی نغمے میں ڈھل جاتی ہیں اور دور دور تک ایک نشاط انگیز درد کی لے پھیلنے لگتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جسم و جاں میں درد کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ اَن کہی میں بھید بھری پُراسراریت در آنے لگتی ہے اور شاعر کے خدوخال نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

ذوالفقار عادل کے تخلیقی وجدان کی بنیادوں پر اٹھائے گئے شہرِ خواب کی عجیب انداز میں تعمیر کا حُسن دریافت کے مرحلے سے گزرتا ہے اور شعر و سخن کا مسافر، لفظیات کی گرہ کشائی کرتے ہوئے خیال و معنی کا اسیر ہو جاتا ہے اور وہ خود کو طلسم خیز فضا میں پاتا ہے۔ اور جب معاملاتِ زندگی اُسے چونکاتے ہیں اور وہ بے حد مسافت کا احساس لیے شعور کی دنیا میں واپس لوٹتا ہے تو کچھ دیر کو گردشِ کائنات کا نظام درہم برہم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

نکلا ہوں شہرِ خواب سے، ایسے عجیب حال میں
غرب مرے جنوب میں، شرق مرے شمال میں

اور پھر اس پُراسرار شہر کا سفر نامہ تحریر کرنا چاہتا ہے، تو خود کو عاجز پاتا ہے۔

کچھ ایسی ہی صورت حال سے گزشتہ تیس دنوں سے میں بھی دو چار ہوں۔ جب جب ذوالفقار عادل کے شعری نظام کی کیفیت میں داخل ہوتی ہوں، گہری حیرت کا سبب ہونے والی خموشی مجھ میں ٹھہر جاتی ہے۔ ایک بار پھر اس شہرِ خواب کو سوچنے لگتی ہوں جو ''شرق مرے شمال میں'' کے شاعر کی نیندوں کا بوجھ ڈھوتی آنکھوں میں جنم لیتا ہے۔ وہ اچاٹ نیند، جو آشوبِ تنہائی کی دین ہے اور ایسی تنہائی جو ہجوم میں لاحق ہوتی ہے، (پکارے جا رہا ہوں کیا کوئی ہے)، جو بے انت وقت کی رائیگانی پر سوالیہ نشان لگاتی ہے، (وقت کے عارضے میں ہوں، گزرا ہوا سمجھ مجھے)، گنجان شہروں میں رہتے بستے مغائرت میں مبتلا کرتی ہے، (لیکن اِک ایسے شہر میں کیا کر رہے ہیں ہم)، جہاں لوگ سایوں میں ڈھل چکے ہیں، آوازوں کا روپ دھار چکے ہیں، (''اِک کمرا سایوں سے بھرا ہے، اِک کمرا آوازوں سے'')، جہاں موجود مسلسل بے اطمینانی کا استعارہ ہے، (اور ناموجود کی دُھن میں لگا رہتا ہوں میں)، آبادیوں، روشنیوں اور سہولتوں کے درمیان خالی پن در آیا ہے، (روز نکل جاتے ہیں خالی گھر

سے خالی دِل کو لے کر)، سامانِ زندگی کے ہوتے ہوئے کچھ نہ ہونے کا احساس، علیحدگی کے ساتھ برگشتگی پیدا کر رہا ہے (کوئی نہیں بتا سکا، نہیں ہوں یا نہاں ہوں میں)۔ الجھنوں کے عہد میں، خوف کا دور گزارتے ہوئے یہ طرزِ احساس صنعتی سماج کی دین ہے۔ جہاں فرد بمعنی اشیاء ہے۔ اور چاہے اشیاء کا نام کچھ بھی ہو وہ اپنی کمیت میں اشیاء ہی کہلاتی ہیں یا سمجھی جاتی ہیں۔ (اگرچہ اشیاء کے بھی نام ہوتے ہیں)۔

بے نامی کی اِس فضا میں شاعر خود کو معروض میں رکھنا چاہتا ہے، (زمیں پہلی محبت ہے ہماری)، تاریخ کے کسی لمحے سے اثبات چاہتا ہے، (مری شناخت کچھ نہیں، بیادِ رفتگاں ہوں میں)، جغرافیہ کے کسی خطّے کی آب و ہوا میں رچنا بسنا چاہتا ہے، (ہمیں دریافت ہونے کی خوشی ہے)، اپنی ہی ذات کی تلاش اُس کا مسئلہ ہے کہ مسلسل گمشدگی اُسے بے نشان کرنے پر تلی ہوئی ہے، (گمشدہ چیزوں کے اندر لا پتا رہتا ہوں میں)۔

وہ مستقل بنیادوں پر خود کو کہیں نہ پاتے ہوئے اداس ہو جاتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ زندگی میں اس کی شمولیت نہ ہونے کے برابر ہو رہی ہے۔ اداسی کے یہ سوالات اس کی شاعری میں تکرار کرتے ہیں اور اس کے فکری رویّوں کا تعین کرتے ہیں۔ وہ صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

جتنی گہرائی ہے عادلؔ، اتنی ہی تنہائی ہے
بس کہ سطحِ زندگی پر تیرتا رہتا ہوں میں

پُرہجوم شہروں میں موجود ویرانی، سناٹا بن کر اُس کے اندر اتر جاتی ہے۔ ذات میں ایک بحرانی کیفیت کا مدوجزر اُٹھنے لگتا ہے۔ درون میں جتنا شور مچتا ہے، شعری اظہار میں اتنا ہی سبک ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خدشہ ہونے لگتا ہے انفعالی رویہ، کہیں اس کے لہجے کی شناخت نہ بن جائے۔ دھیمے پن کے ساتھ غموں اور دکھوں کے لئے دل کا راستہ کھلا کر دینے کے باوجود اس کے تیور اثباتی ہو جاتے ہیں اور خدا کی نیابت کا امین دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کے لہجے کی سنجیدگی، اس کی تہذیب کی آئینہ داری کرتی ہے۔ خیال کی ایک لہر اور جذبے کا ارتعاش سلیقے سے شعر میں ڈھل جاتا ہے اور اس کا ہونا، کائنات کی بنیادگری کا اہم معاملہ

دِکھنے لگتا ہے۔

صاحب، تمھیں خبر ہی کہاں تھی کہ ہم بھی ہیں
ویسے تو اب بھی ہیں، کوئی مر بھی نہیں گئے

اپنے ہونے کو اہم جاننا یا اپنے آپ سے مشروط ہونا با اعتمادی کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس کا فکری معاملہ جمالیاتی شعور کے ساتھ ربط میں آجاتا ہے۔ وہ شور اور خاموشی کی درمیانی کیفیت کو تلاش کر لیتا ہے۔ وہ موجود اور نا موجود کے پیچ اسرار کو کھوج لیتا ہے۔ اشیاء اور غیر اشیاء کے مابین رشتے کو سمجھ لیتا ہے۔ آسودگیِ جسم و جاں کے اندر روح کی طلب کو جان لیتا ہے۔ تقدیر کا جبر اور سرکش سرشت کا تجزیہ کر لیتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے شعری اسلوب اور موضوعات میں ہر سطح پر مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ یکسانیت اور اختلاف کی امتزاجی کیفیت ہر شعر میں محسوس ہوتی ہے۔ تخلیقی اُپج کے ساتھ اظہارِ غزل کے مزاج میں ندرت کا حسن بھر دیتی ہے۔

کچھ اِتنے کل جمع ہو گئے ہیں کہ آج کم پڑتا جا رہا ہے
میں اِن پرندوں کو اپنی چھت سے اُڑا رہا ہوں، معاف کرنا

سوچا یہ تھا، وقت ملا تو ٹوٹی چیزیں جوڑیں گے
اب کونے میں ڈھیر لگا ہے، باقی کمرا خالی ہے

ذوالفقار عادل اپنے تخلیقی موڈ میں، شور اور آوازوں بھری اس دنیا میں پُرسکون گوشے کے متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ گوشہ ان کا اپنا کمرہ بھی ہو سکتا ہے، (اکثر وہی ہوتا ہے) کہ وہ ورائے کائنات دیکھنے کے بجائے، دیوار پر بنتے بگڑتے سایوں کو کرداروں میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں اور یہ ایک دوسرے میں ڈوبتے اُبھرتے کردار ایک طویل سلسلے وار کہانی کہتے نظر آتے ہیں۔ یہ کہانیاں انہیں اپنے ساتھ کسی پُراسرار مقام پر لے جاتی ہیں اور کسی موڑ پر آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ پا کر درمیان میں رُک جاتی ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان کہانیوں سے اکثر آگے نکل جاتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والی کہانی کا قصہ ان کے شعروں

میں جگہ پاتا ہے۔ نامعلوم، ناموجود کی دریافت، نامحسوس طور پر ہوتی ہے اور ذوالفقار عادل بحیثیت کہانی کار، زندگی کے پھیلاؤ پر محیط لمحوں کی کہانی سہولت سے چند لفظوں میں کہہ گزرتے ہیں۔

کام مکمل کرنے سے بھی، شام مکمل کب ہوتی ہے
ایک پرندہ رہ جاتا ہے، باقی سب گھر آجاتے ہیں

بیان کر دینے والی بات کے پس منظر میں ان کہی کا رمز ذوالفقار عادل کا اختصاص ہے۔ جہاں الفاظ گہری کیفیات کو ظاہر کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں، وہاں شدّتِ احساس عمومی رویّوں سے ابھرنے لگتا ہے۔ اور خالی جگہ، پُر ہوتی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ الماری، چابی، میز، دروازے، ٹوٹی پھوٹی چیزوں سے بھی معنویت کا ایک نیا مفہوم نکال لیتے ہیں۔ یہ بے حد عام سی اشیاء کرداروں کی کیفیت بن جاتی ہیں اور تحیر خیزی کا سامان بن کر حیرانی کا تاثر دینے لگتی ہیں اور بے ترتیبی میں ترتیب کا حسن، نئی جمالیات سے دریافت ہوتا ہے۔

جتنا اِن سے بھاگ رہا ہوں، اُتنا پیچھے آتی ہیں
ایک صدا جاروب کشی کی، اِک آواز بھکاری کی

دیوار کے ساتھ ساتھ، آواز شاعر کا بنیادی استعارہ ہونا چاہیے تھا۔ شور میں دبی رہ جانے والی آواز کی کم مائیگی کا احساس اسے شدت سے مضطرب کرتا ہے۔ اجنبیت اور لا تعلقی کی لہر اس کے وجود سے یوں بھی ٹکراتی ہے کہ آوازوں سے عیاں ہونے والا مفہوم اس کی تنہائی کو دو چند کر دیتا ہے۔ وہ خاموش پسند طبیعت کی مناسبت سے شور کو بار بار مستعار لیتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ شور کو خاموش کروانا چاہتا ہے کہ وہ کائناتِ وقت کے ساتھ ردھم میں آ سکے۔ جس کی اپنی ایک فطری رفتار ہے۔ جو بے آواز گزرتا جا رہا ہے۔

کون سنتا ہے یہاں، کون سنا سکتا ہے
شور، اِس شہر میں ایسا ہے کہ کچھ بھی کہیے

ذوالفقار عادل کی شاعری میں دیوار کی معنویت بھی قابل غور ہے۔ وہ دیواریں جو عافیت کی پناہ گاہ ہوتی ہیں۔ رازوں کی امانت داری کرتی ہیں۔

شاید وہ سب سے زیادہ آپ کی تعلق دار ہوتی ہیں۔ اپنے آپ میں سمیٹ کر رکھتی ہیں اور خاموشی میں آپ کا دکھ درد بانٹتی ہیں۔ ان ہی دیواروں کی اپنائیت کو اہم جانتے ہوئے شاعر کی قوتِ تخلیق دو چند ہو جاتی ہے۔

جانے کیا باتیں کرتی ہیں، دن بھر آپس میں دیواریں
دروازے پہ قفل لگا کر، ہم تو دفتر آ جاتے ہیں

''شرق مرے شمال میں'' کی غزلیات، قاری سے یکسوئی کا مطالبہ کرتی ہیں، اس مطالبے کی بارآوری پر ایک انبساطی لہر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے اور ایک بہت عمدہ شاعر کی دریافت شاعری کی روشن راہوں کا پتا دیتی ہے۔

سائرہ غلام نبی
مئی ۲۰۱۵

دیوار اور میں

(غزلیں)

کچھ بھی کہا نہ جا سکا، چاہا تو تھا کہیں کہ بس
رات غزل نے ہم سے کیں، اِتنی شکایتیں کہ بس

اِک عمر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے
اِک دوسرے کے خوف سے دیوار اور میں

پیڑوں سے بات چیت ذرا کر رہے ہیں ہم
نادیدہ دوستوں کا پتا کر رہے ہیں ہم

دل سے گزر رہا ہے کوئی ماتمی جلوس
اور اس کے راستے کو کھُلا کر رہے ہیں ہم

اک ایسے شہر میں ہیں جہاں کچھ نہیں بچا
لیکن اک ایسے شہر میں کیا کر رہے ہیں ہم

پلکیں جھپک جھپک کے اڑاتے ہیں نیند کو
سوئے ہوؤں کا قرض ادا کر رہے ہیں ہم

کب سے کھڑے ہوئے ہیں کسی گھر کے سامنے
کب سے اک اور گھر کا پتا کر رہے ہیں ہم

اب تک کوئی بھی تیر ترازو نہیں ہوا
تبدیل اپنے دل کی جگہ کر رہے ہیں ہم

ہاتھوں کے ارتعاش میں بادِ مراد ہے
چلتی ہیں کشتیاں کہ دعا کر رہے ہیں ہم

واپس پلٹ رہے ہیں ازل کی تلاش میں
منسوخ آپ اپنا لکھا کر رہے ہیں ہم

عادلؔ سجے ہوئے ہیں سبھی خواب خوان پر
اور انتظارِ خلقِ خدا کر رہے ہیں ہم

◈

شب میں دن کا بوجھ اٹھایا، دن میں شب بیداری کی
دل پر دل کی ضرب لگائی، ایک محبت جاری کی

کشتی کو کشتی کہہ دینا ممکن تھا، آسان نہ تھا
دریاؤں کی خاک اُڑائی، ملّاحوں سے یاری کی

کوئی حد، کوئی اندازہ، کب تک گِرتے جانا ہے
خندق سے خاموشی گہری، اُس سے گہری تاریکی

اک تصویر مکمل کر کے اُن آنکھوں سے ڈرتا ہوں
فصلیں پک جانے پر جیسے دہشت اک چنگاری کی

ہم انصاف نہیں کر پائے، دنیا سے بھی، دل سے بھی
تیری جانب مڑ کر دیکھا، یعنی جانب داری کی

خواب ادھورے رہ جاتے ہیں، نیند مکمل ہونے سے
آدھے جاگے، آدھے سوئے، غفلت بھر ہُشیاری کی

جِتنا اِن سے بھاگ رہا ہوں، اُتنا پیچھے آتی ہیں
ایک صدا جاروب کشی کی، اک آواز بھکاری کی

اپنے آپ کو گالی دے کر گھور رہا ہوں تالے کو
الماری میں بھول گیا ہوں پھر چابی الماری کی

گھٹتے بڑھتے سائے سے عادلؔ، لطف اٹھایا سارا دن
آنگن کی دیوار پہ بیٹھے، ہم نے خوب سواری کی

◈

کیا توقّع کرے کوئی ہم سے
اک محبت نہ ہو سکی ہم سے

بات اُس کم سخن کی کرتے ہیں
چھن نہ جائے سخن وری ہم سے

باغ ایسا اُتر گیا دل میں
پھر وہ کھڑکی نہیں کُھلی ہم سے

خوش گمانی سے ہو گئے تصویر
ایک دیوار آ لگی ہم سے

چاک دل کا بہت نمایاں ہے
کون سیکھے رفوگری ہم سے

اب کہاں ہے وہ خواب سی صورت
اُس میں جو بات تھی، وہ تھی ہم سے

ہم سفر تھا غبارِ راہِ فنا
اَبر سمجھے جسے کئی ہم سے

دشتِ امکاں میں دُور تک عادل
فصلِ کُن ہے ہری بھری ہم سے

◈

عمریں گزار کر یہاں، پیڑوں کی دیکھ بھال میں
بیٹھے ہیں ہم نشیں مرے، سایۂ ذوالجلال میں

پیچھے جو رہ گیا تھا شہر، پیچھے پڑا ہوا ہے یوں
روتا ہوں بات بات پر، ہنستا ہوں سال سال میں

پوچھتا پھر رہا ہوں میں، دل میں جو ایک بات ہے
کوئی جواب دے نہ دے، دخل نہ دے سوال میں

چیخ نہیں سکا کبھی، آگ نہیں لگا سکا
جلتا رہا ہوں رات دن، آتشِ اعتدال میں

زخم کا رنگ اَور تھا، داغ کا رنگ اَور ہے
کتنا بدل گیا ہوں میں، عرصۂ اندمال میں

*وہیل چیئر پہ بیٹھ کر، چڑھتا ہے کون سیڑھیاں
آ کے مجھے ملے جسے، شک ہو مرے کمال میں

اپنی جگہ سے ہٹ کے دیکھ، پھر وہ جگہ پلٹ کے دیکھ
میں جو نہیں تو اب وہاں، کیا ہے ترے خیال میں

* اکبر معصوم کی نذر

◈

یہ میز، یہ کتاب، یہ دیوار اور میں
کھڑکی میں زرد پھولوں کا انبار اور میں

ہر شام اِس خیال سے ہوتا ہے جی اُداس
پنچھی تو جا رہے ہیں اُفق پار، اور میں!

اک عمر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے
اک دوسرے کے خوف سے دیوار اور میں

سرکار! ہر درخت سے بنتے نہیں ہیں تخت
قربان آپ پر مرے اوزار اور میں

لے کر تو آ گیا ہوں مرے پاس جو بھی تھا
اب سوچتا ہوں تیرا خریدار، اور میں!

خوشبو ہے اک فضاؤں مـیں پھیلی ہوئی، جسے
پہچانتے ہیں صرف سگِ یار اور مـیں

کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے نکلا تھا آفتاب
دنیا تو مل گئی سرِ بازار، اور مـیں!

◈

اب اسے عیب سمجھ لیجیے، خوبی کہیے
پھر وہ مٹی نہیں رہتی جسے مٹی کہیے

کس کو ٹھہرائیے ٹوٹی ہوئی چیزوں کا امیں
اپنی لُکنت کا سبب کس کی زبانی کہیے

گفتگو سے نکل آتے ہیں، ہزاروں رستے
ذرا دیوار کی سنیے، ذرا اپنی کہیے

خود سے جو بات بھی کرتے ہیں، خدا سنتا ہے
خود کلامی کہاں ممکن ہے، کلیمی کہیے

کون سنتا ہے، یہاں کون سُنا سکتا ہے
شور اِس شہر میں ایسا ہے کہ کچھ بھی کہیے

ایسی ویرانی ہے عادلؔ کہ فنا لگتی ہے
مجھ میں کیا بات ہے ایسی، جسے ہستی کہیے

◈

جانے ہم یہ کِن گلیوں میں خاک اُڑا کر آ جاتے ہیں
عشق تو وہ ہے جس میں ناموجود میسر آ جاتے ہیں

جانے کیا باتیں کرتی ہیں دن بھر آپس میں دیواریں
دروازے پر قفل لگا کر، ہم تو دفتر آ جاتے ہیں

کام مکمل کرنے سے بھی، شام مکمل کب ہوتی ہے
ایک پرندہ رہ جاتا ہے، باقی سب گھر آ جاتے ہیں

اپنے دل میں گیند چھپا کر، اِن میں شامل ہو جاتا ہوں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے سارے بچے میرے اندر آ جاتے ہیں

میم محبت پڑھتے پڑھتے، لکھتے لکھتے کاف کہانی
بیٹھے بیٹھے اِس مکتب میں، خاک برابر آ جاتے ہیں

روز نکل جاتے ہیں خالی گھر سے، خالی دل کو لے کر
اور اپنی خالی تربت پر پھول سجا کر آ جاتے ہیں

خاک میں انگلی پھیرتے رہنا، نقش بنانا، وحشت لکھنا
اُن وقتوں کے چند نشاں، اب بھی کوزوں پر آ جاتے ہیں

نام کسی کا رٹتے رٹتے ایک گرہ سی پڑ جاتی ہے
جن کا کوئی نام نہیں، وہ لوگ زباں پر آ جاتے ہیں

پھر بستر سے اُٹھنے کی بھی مہلت کب ملتی ہے عادلؔ
نیند میں آتی ہیں آوازیں، خواب میں لشکر آ جاتے ہیں

◈

چرچ کی سیڑھیاں، وائلن پر کوئی دُھن بجاتا ہوا
دیکھتا ہے مجھے، اِک ستارہ کہیں ٹمٹماتا ہوا

ڈوب جاتا ہوں، پھر اُڑنے لگتا ہوں، پھر ڈوب جاتا ہوں میں
اِک پری کو کسی جل پری کی کہانی سناتا ہوا

میں خدا سے تو کہہ سکتا ہوں ''دیکھ، سُن'' پر خلا سے نہیں
اپنے اندر ہی پھر لوٹ جاتا ہوں میں، باہر آتا ہوا

ہے کہاں تک تماشا، کہاں تک خلل، کوئی کیسے کہے
ایک رعشہ زدہ ہاتھ کٹھ پُتلیوں کو نچاتا ہوا

دائرہ اِس مثلث کے باہر بھی ہے اور اندر بھی ہے
ایک نقطہ ہے دِل، لطف ہر مسئلے کا اٹھاتا ہوا

پاؤں رکھتا ہوں اِک منجمد جھیل میں، چاند کے عکس پر
ایک تنہائی سے، ایک گہرائی سے خوف کھاتا ہوا

باغ اپنی طرف کھینچتا تھا مجھے، خواب اپنی طرف
بنچ پر سو رہا ہوں میں دونوں کا جھگڑا چُکاتا ہوا

ایک بستی ہے یہ، لوگ بھی ہیں یہاں اور تالاب بھی
ابر جیسے اِسے جانتا ہی نہ ہو، آتا جاتا ہوا

بسترِ مرگ پر نبض ہی وقت ہے، نبض ہی یاد ہے
کوئی منظر کہیں سے اُبھرتا ہوا، ڈوب جاتا ہوا

رات پکڑا گیا، اور باندھا گیا، اور مارا گیا
ایک لڑکا سا دل، میرؔ کے باغ سے پھل چُراتا ہوا

◈

کس کو سمجھائیں کہ حضرت! سمجھو
دل کو دنیا کی طرح مت سمجھو

تم مجھے کچھ بھی سمجھ سکتے ہو
کچھ نہیں ہوں تو غنیمت سمجھو

یہ جو دریا کی خموشی ہے اِسے
ڈوب جانے کی اجازت سمجھو

ایک دن خاک تو ہو جانا ہے
رائیگانی کو ریاضت سمجھو

میں نہ ہوتے ہوئے ہو سکتا ہوں
تم اگر میری ضرورت سمجھو

یہ جو آنکھوں میں نمی ہے عادل
ڈوبنے والوں کی غفلت سمجھو

◈

نہیں کہ مشتِ خاک ہوں، نہیں کہ خاک داں ہوں میں
اِنھی کی ایک شکل ہوں، اِنھی کے درمیاں ہوں میں

بہت سُنا گیا مجھے، بہت سُنا دیا گیا
ہزار سال بعد بھی، ہزار داستاں ہوں میں

مرے لیے جو ہوش ہے، فریبِ چشم و گوش ہے
یہ کون مے فروش ہے، یہ کس کا راز داں ہوں میں

لِکھا گیا، ہُوا نہیں، پڑھا گیا، کھُلا نہیں
زباں کا عیب جانیے کہ حرفِ رائیگاں ہوں میں

یہ گھر وہ گھر نہیں میاں! غبارِ ماہ و سال ہے
مری شناخت کچھ نہیں، بیادِ رفتگاں ہوں میں

بھلا ہُوا کہ قافلے، مری تلاش میں نہ تھے
پکارنا نہیں پڑا کہ صاحبو! یہاں ہوں میں

کبھی نہ کچھ سُنا سکا، کہیں نظر نہ آسکا
کوئی نہیں بتا سکا، نہیں ہوں یا نہاں ہوں میں

◈

میں جہاں تھا وہیں رہ گیا، معذرت
اے زمیں معذرت، اے خدا، معذرت

کچھ بتاتے ہوئے، کچھ چھُپاتے ہوئے
میں ہنسا، معذرت، رو دیا، معذرت

جو ہُوا، جانے کیسے ہُوا، کیا خبر
جو کِیا، وہ نہیں ہو سکا، معذرت

ہم سے گریہ مکمل نہیں ہو سکا
ہم نے دیوار پر لِکھ دیا، معذرت!

میں کہ خود کو بچانے کی کوشش میں تھا
ایک دن میں نے خود سے کہا، معذرت

خود تمھاری جگہ جا کے دیکھا ہے اور
خود سے کی ہے تمھاری جگہ معذرت

میں بہت دُور ہوں، شام نزدیک ہے
شام کو دو صدا، شکریہ، معذرت

◈

شُکر کیا ہے اِن پیڑوں نے، صبر کی عادت ڈالی ہے
اِس منظر کو غور سے دیکھو، بارش ہونے والی ہے

سوچا یہ تھا وقت ملا تو ٹوٹی چیزیں جوڑیں گے
اب کونے میں ڈھیر لگا ہے، باقی کمرا خالی ہے

بیٹھے بیٹھے پھینک دیا ہے آتش دان میں کیا کیا کچھ
موسم اِتنا سرد نہیں تھا جتنی آگ جلا لی ہے

اپنی مرضی سے سب چیزیں گھومتی پھرتی رہتی ہیں
بے ترتیبی نے اِس گھر میں اِتنی جگہ بنا لی ہے

دیر سے قفل پڑا دروازہ، اک دیوار ہی لگتا تھا
اس پر ایک کُھلے دروازے کی تصویر لگا لی ہے

ہر حسرت پر ایک گرہ سی پڑ جاتی تھی سینے میں
رفتہ رفتہ سب نے مل کر دل سی شکل بنا لی ہے

اوپر سب کچھ جل جائے گا، کون مدد کو آئے گا
جس منزل پر آگ لگی ہے، سب سے نیچے والی ہے

''اک کمرا سایوں سے بھرا ہے، اک کمرا آوازوں سے[1]''
آنگن میں کچھ خواب پڑے ہیں، ویسے یہ گھر خالی ہے

پیروں کو تو دشت بھی کم ہے، سر کو دشت نوردی بھی
عادلؔ ہم سے چادر جتنی پھیل سکی، پھیلا لی ہے

---

[1] سلمٰی ذوالفقار (اہلیہ)

◈

تجھ میں پڑا ہُوا ہوں میں، پھر بھی جُدا سمجھ مجھے
میں نے تجھے سمجھ لیا، تُو بھی ذرا سمجھ مجھے

سبزہ اُگا کہ خاک اُڑا، قبضے میں رکھ کہ چھوڑ جا
بھول سے بھر کہ دھیان سے، خالی جگہ سمجھ مجھے

ہاتھ میں کل جو ہاتھ تھا، نبض پہ آ گیا ہے آج
وقت کے عارضے میں ہوں، گزرا ہوا سمجھ مجھے

جِتنا اٹھا سکے یہ بوجھ، اُتنا اٹھا مرے عزیز
جِتنا سمجھ میں آ سکے، اُتنا بڑا سمجھ مجھے

خود کو سمجھ، خدا سے مل، ہے جو یہاں پہ مستقل
میری تلاش میں نہ پھر، خلقِ خدا سمجھ مجھے

کالے لباس کا مجھے ایسا بھی تجربہ نہیں
ہنستا بھی ہوں اگر کبھی، روتا ہوا سمجھ مجھے

دینے کو کچھ نہیں یہاں، میں بھی "نہیں" کی شکل ہوں
آ ہی گیا ہے تو اگر، خالی نہ جا، سمجھ مجھے

اِتنا بتا کہ شہر میں، کِتنے سمجھ سکے تجھے
کِتنوں کو تو سمجھ سکا، اب تو ذرا سمجھ مجھے

وہ بوڑھا اِک خواب ہے اور اِک خواب میں آتا رہتا ہے
اُس کے سَر پر اَن دیکھا پنچھی منڈلاتا رہتا ہے

ناٹک کے کرداروں میں کچھ سچّے ہیں، کچھ جھوٹے ہیں
پردے کے پیچھے کوئی ان کو سمجھاتا رہتا ہے

بستی میں جب چاک گریباں، گِریہ کرتے پھرتے ہیں
اُس موسم میں، ایک رفوگر ہنستا گاتا رہتا ہے

ہر کردار کے پیچھے پیچھے چل دیتا ہے قصّہ گو
یونہی بیٹھے بیٹھے اپنا کام بڑھاتا رہتا ہے

اُس دن بھی جب بستی میں تلواریں کم پڑ جاتی ہیں
ایک مدبّر آہن گر زنجیر بناتا رہتا ہے

آوازوں کی بھیڑ میں اِک خاموش مسافر دِھیرے سے
نامانوس دُھنوں میں کوئی ساز بجاتا رہتا ہے

دیکھنے والی آنکھیں ہیں اور دیکھ نہیں پاتیں کچھ بھی
اِس منظر میں جانے کیا کچھ آتا جاتا رہتا ہے

اِس دریا کی تہہ میں عادلؔ ایک پرانی کشتی ہے
اِک گرداب مسلسل اس کا بوجھ بڑھاتا رہتا ہے

یہ راستے میں جو شب کھڑی ہے، ہٹا رہا ہوں، معاف کرنا
بغیر اجازت، میں دِن کو بستی میں لا رہا ہوں، معاف کرنا

زمین بنجر تھی تم سے پہلے، پہاڑ خاموش، دشت خالی
کہانیو! میں تمھیں کہانی سنا رہا ہوں، معاف کرنا

کچھ اِتنے کل جمع ہو گئے ہیں کہ آج کم پڑتا جا رہا ہے
میں اِن پرندوں کو اپنی چھت سے اُڑا رہا ہوں، معاف کرنا

یہ بے یقینی عجب نشہ ہے، یہ بے نشانی عجب سکوں ہے
میں اِن اندھیروں کو روشنی سے بچا رہا ہوں، معاف کرنا

اِنھیں ستاروں کے سب لطائف سنا چکا ہوں، ہنسی ہنسی میں
اور اب چراغوں سے اپنا دامن بچا رہا ہوں، معاف کرنا

مجھے بتانے کا فائدہ کیا، مکین کیا تھے؟ مکان کیا ہیں؟
میں اِس گلی سے نہ آ رہا ہوں، نہ جا رہا ہوں، معاف کرنا

◈

کچھ بھی وہاں بچا نہیں
اب یہ پتا، پتا نہیں

جتنا اُڑا دِیا گیا
اُتنا غبار تھا نہیں

پانی میں عکس ہے مرا
پانی مگر مرا نہیں

پھر وہ غزالِ دم بخود
مرتا رہا، مَرا نہیں

گزرا ہے وقت اس طرح
خالی کوئی جگہ نہیں

سوچا کہ رات ڈھل گئی
سوچا، مگر کہا نہیں

کشتی تو بن گئی مگر
کشتی سے کچھ بنا نہیں

میں بھی کہیں نہیں رہا
مجھ میں کوئی رہا نہیں

کبھی خوشبو، کبھی آواز بن جانا پڑے گا
پرندوں کو کسی بھی شکل میں آنا پڑے گا

خود اپنے سامنے آتے ہوئے حیران ہیں ہم
ہمیں اب اُس گلی سے گھوم کر جانا پڑے گا

اِسے یہ گھر سمجھنے لگ گئے ہیں رفتہ رفتہ
پرندوں سے قفس آزاد کروانا پڑے گا

اُداسی وزن رکھتی ہے، جگہ بھی گھیرتی ہے
ہمیں کمرے کو خالی چھوڑ کر جانا پڑے گا

میں پچھلے بنچ پر سہما، ڈرا بیٹھا ہوا ہوں
سمجھ میں کیا نہیں آیا، یہ سمجھانا پڑے گا

یہاں دامن پہ نقشہ بن گیا ہے آنسوؤں سے
کسی کی جستجو میں دُور تک جانا پڑے گا

تعارف کے لیے چہرہ کہاں سے لائیں گے ہم
اگر چہرہ بھی ہو تو نام بتلانا پڑے گا

کہیں صندوق ہی تابوت بن جائے نہ اِک دن
حفاظت سے رکھی چیزوں کو پھیلانا پڑے گا

''خدا حافظ'' بلند آواز میں کہنا پڑے گا
پھر اُس آواز سے آگے نکل جانا پڑے گا

جہاں پیشین گوئی ختم ہو جائے گی آخر
ابھی اِس راہ میں اِک اور ویرانہ پڑے گا

یہ جنگل باغ ہے عادلؔ، یہ دلدل آبجو ہے
کہیں کچھ ہے جسے ترتیب میں لانا پڑے گا

◈

اِک دن میں چھُپا ہُوا دِن، اِک شب میں کٹی ہوئی شب
کیا خواب دِکھاتی ہے، اِک خواب سے لی ہوئی شب

ہم دن کی تمنّا کو عِزّت سے کہیں رکھ لیں
بس اتنی جگہ دے دے، اے گھر میں بھری ہوئی شب

بس لطف اُٹھاتے ہیں، سبزے کی عنایت سے
ہم دیکھ نہیں سکتے، شبنم میں چھپی ہوئی شب

ممکن ہے کہ دُھلنے سے، کچھ اور نکھر جائے
دن تو نہیں بن سکتی، بارش میں پڑی ہوئی شب

کاغذ جنھیں چننے ہوں، تحریر نہیں پڑھتے
ردّی بھی نہیں بنتی، قسمت میں لکھی ہوئی شب

باتوں سے بُنیں اِس کو، آنکھوں سے سُنیں اِس کو
پہروں میں نہ ڈھل جائے، لمحوں سے بھری ہوئی شب

جب راہ ملی عادل، اندر بھی گرے آنسو
تنہائی میں کام آئی، مجلس میں کٹی ہوئی شب

◈

آخری شب ہوں، شہر زاد
میں تجھے کیوں نہیں ہوں یاد

ایسے ملی وہ شب مجھے
جیسے کسی سخن کو داد

دنیا بدل گئی مری
دنیا سے معذرت کے بعد

میرے لیے تو ہے یہاں
شہر سے بے گھری مراد

بادِ چہار سمت سے
مجھ میں کھِلا گلِ تضاد

برف پگھل رہی ہے بس
اپنی جگہ ہے اِنجماد

کوزہ گری ہے دشت کی
گرد نہیں یہ گرد باد

جیسی فلک پہ خامشی
ویسا زمین پر فساد

کہنا ہے اور کچھ مجھے
اِس سے خلل نہیں مراد

کیا مرض ہے، صاحبو
چارہ گری پہ اعتقاد

کرتا ہوں آرزو کا وِرد
کہتا ہوں خود کو خیر باد

سارا باغ اُلجھ جاتا ہے ایسی بے ترتیبی سے
مجھ میں پھیلنے لگ جاتی ہے خوشبو، اپنی مرضی سے

ہر منظر کو مجمع میں سے، یوں اُٹھ اُٹھ کر دیکھتے ہیں
ہو سکتا ہے شہرت پالیں، ہم اپنی دلچسپی سے

اِن آنکھوں سے دو اِک آنسو ٹپکے ہوں تو یاد نہیں
ہم نے اپنا وقت گزارا، ہر ممکن خاموشی سے

برف جمی ہے منزل منزل، رستے آتش دان میں ہیں
بیٹھا راکھ کرید رہا ہوں، میں اپنی بیساکھی سے

خوابوں کے خوش حال پرندے، سر پر یوں منڈلاتے ہیں
دُور سے پہچانے جاتے ہیں، ہم اپنی بے خوابی سے

دِل سے نکالے جا سکتے ہیں، خوف بھی اور خرابے بھی
لیکن ازل، ابد کو عادل، کون نکالے بستی سے

◈

پکارے جا رہا ہوں، کیا کوئی ہے؟
یہاں خاموش رہنا، خودکشی ہے

زمیں پہلی محبت ہے ہماری
(اگر پہلی محبت ہو چکی ہے)

ہوا سب سے بڑی جارُوب کش ہے
زمیں کا چپّہ چپّہ جانتی ہے

یہ کس نے ہاتھ پیشانی پہ رکھا
ہماری نیند پوری ہوگئی ہے

یہ جو بھی لوگ ہیں اِن کشتیوں میں
ہمیں دریافت ہونے کی خوشی ہے

یہاں اِک شور بڑھتا جا رہا ہے
خدا کی بات پوری ہو رہی ہے

ہمیں کہنا تھا کچھ، اپنے لیے بھی
مگر یہ بات پہلے ہو چکی ہے

یہ جو بہتا ہوا تختہ ہے عادلؔ
سمجھ لیجے کہ اب کشتی یہی ہے

◈

نکلا ہوں شہرِ خواب سے، ایسے عجیب حال میں
غرب، میرے جنوب میں، شرق، مرے شمال میں

کوئی کہیں سے آئے اور مجھ سے کہے کہ زندگی
تیری تلاش میں ہے دوست، بیٹھا ہے کس خیال میں

ڈھونڈتے پھر رہے ہیں سب، میری جگہ، مرا سبب
کوئی ہزار میل میں، کوئی ہزار سال میں

لفظوں کے اِختصار سے، کم تو ہوئی سزا مری
پہلے کہانیوں میں تھا، اب ہوں میں اِک مثال میں

میز پہ روز صُبح دم، تازہ گلاب دیکھ کر
لگتا نہیں کہ ہو کوئی، مجھ سا مرے عیال میں

پھول کہاں سے آئے تھے، اور کہاں چلے گئے
وقت نہ تھا کہ دیکھتا، پودوں کی دیکھ بھال میں

کمروں میں بستروں کے بیچ کوئی جگہ نہیں بچی
خواب ہی خواب ہیں یہاں آنکھوں کے ہسپتال میں

گُرگ و سمند و مُوش و سگ، چھانٹ کے ایک ایک رگ
پھرتے ہیں سب الگ الگ، رہتے ہیں ایک کھال میں

◈

رات گزری، نہ کم ستارے ہوئے
منکشِف ہم پہ ہجر سارے ہوئے

ناؤ دو لخت ہوگئی، اِک دن
دو مسافر تھے، دو کنارے ہوئے

پھول دلدل میں کھل رہا ہے یہاں
ہم ہیں اِک جسم پر اتارے ہوئے

جانے کس وقت نیند آئی ہمیں
جانے کس وقت ہم تمھارے ہوئے

مُدّتوں بعد کام آئے ہیں
چند لمحے کہیں گزارے ہوئے

اپنی چھت پر اُداس بیٹھے ہیں
ہم پرندوں کا روپ دھارے ہوئے

◈

وہ مرے غم سے آشنا ہو جائے
اِس سے پہلے کہ انتہا ہو جائے

میں اُسے دیکھتا رہوں اور وہ
دیکھتے دیکھتے مرا ہو جائے

اِس سے آگے جنوں اضافی ہے
دشت کو چاہیے بڑا ہو جائے

لیجیے رات کاٹ دی ہم نے
اب کسی دِن کی ابتدا ہو جائے

دیکھ کے چل یہاں کہ ممکن ہے
لغزشِ پا ہی نقشِ پا ہو جائے

شہر کا حال دیکھنا عادلؔ
جب وہ درویش لاپتا ہو جائے

◈

رُوپ بدل کر، جانے کِس پل، کیا بن جائے ، مائے نی
دِل کا آخِر آ پہنچا ہے، درد کہاں تک جائے نی

اُس کے بعد تو میں تھا، جس نے جنگل بیلے چھانے تھے
میرے بعد اب کون ہے ایسا، جو رانجھا کہلائے نی

میں بھوکے کا بھوکا آخِر، دن نکلے یا شام ڈھلے
روٹی، سالن پی جائے اور سالن، روٹی کھائے نی

کیا دیکھا اور کیا نہ دیکھا، یاد نہیں، کچھ یاد نہیں
نینوں کے کہنے میں آ کر، ہم نے نیر بہائے نی

دنیا، دِل میں، دِل، دنیا میں، کون اِن میں تفریق کرے
وقت کا پہیّہ گھوم رہا ہے، چرخہ کون گھمائے نی

اِک جوگی کے روگی بن کر، رستے میں آ بیٹھے ہیں
چار دنوں کا وقت ہے سارا، جانے وہ کب آئے نی

ایسے روٹی سالن سے تو چولھا ٹھنڈا اچھا ہے
اُس بالن کا کیا کرنا، جو گھر کو آگ لگائے نی

دِل تختی پر، عشق زباں میں، پلکوں سے اور اشکوں سے
کہے حسین فقیر سئیں دا، عادل لکھتا جائے نی

(نذرِ شاہ حسینؒ)

◈

ویرانے کو وحشت زندہ رکھتی ہے
دِل کو ایک محبت زندہ رکھتی ہے

آئینے کو زندہ رکھتا ہوں میں اور
مجھ کو میری حیرت زندہ رکھتی ہے

دیواروں کو، دروازے کو، آنگن کو
گھر آنے کی عادت زندہ رکھتی ہے

صحرا میں بھی آنکھیں خشک نہیں ہوتیں
دریاؤں سے نسبت زندہ رکھتی ہے

اپنے آپ سے کہتا ہوں، میں زندہ ہوں
اور یہی اِک صورت زندہ رکھتی ہے

شور سے پہچانا جاتا ہے شہروں کو
شور کو ایک شکایت زندہ رکھتی ہے

◈

مجھ کو یہ وقت، وقت کو میں، کھو کے خوش ہُوا
کاٹی نہیں وہ فصل، جسے بو کے خوش ہُوا

وہ رنج تھا، کہ رنج نہ کرنا محال تھا
آخر، میں ایک شام، بہت رو کے خوش ہُوا

صاحب، وہ بو گئی نہ وہ نشّہ ہَوا ہُوا
اپنے تئیں میں جام و سبو دھو کے خوش ہُوا

ایسی خوشی کے خواب سے جاگا، کہ آج تک
خوش ہو کے سو سکا، نہ کبھی سو کے خوش ہُوا

چھانی اِک عمر خاک، خوشی کی تلاش میں
ہونا تھا رزقِ خاک مجھے، ہو کے خوش ہُوا

عادلؔ، مرا لباس ہی ہمرنگِ داغ تھا
کارِ رفو کِیا، نہ کبھی دھو کے خوش ہُوا

◈

سولینے دو، اپنا اپنا کام کرو، چپ ہو جاؤ
دروازو! کچھ وقت گزارو، دیوارو! چپ ہو جاؤ

کس کشتی کی عمر ہے کتنی، ملّاحوں سے پوچھنے دو
تم سے بھی پوچھیں گے اِک دن، دریاؤ! چپ ہو جاؤ

دیکھ لیا نا، آخر مٹی، مٹی میں مل جاتی ہے
خاموشی سے اپنا اپنا حصّہ لو، چپ ہو جاؤ

اِس ویران سرا کی مالک، ایک پرانی خاموشی
آوازیں دیتی رہتی ہے، مہمانو! چپ ہو جاؤ

ایسا لگتا ہے، ہم اپنی منزل پر آ پہنچے ہیں
دُور کہیں، یہ رونے کی آواز سنو، چپ ہو جاؤ

خود کو ثابت کرنے سے بھی بڑھ جاتی ہے تنہائی
کون سی گرہیں کھول رہے ہو، سحر گرو! چپ ہو جاؤ

پیڑ پرانا ہو جاتا ہے، نئے پرندے آنے سے
بات ادھوری ہی رہتی ہے، کچھ بھی کہو، چپ ہو جاؤ

◈

اپنی نہ کہوں تو کیا کروں میں
ہر بات کی ابتدا میں ہوں میں

محتاط ہوں، مطمئن نہیں ہوں
محتاط بھی کب تلک رہوں میں

موجود کے ہاتھ آ گیا ہوں
ممکن سے گریز کیا کروں میں

یاں کچھ بھی نہیں مرا اگرچہ
کیا اپنی مثال بھی نہ دوں میں

یہ پھول مرے لیے کِھلے ہیں
ثابت ہی اگر نہ کر سکوں میں

اِک شہر کے بعد، دوسرا شہر
خاموش رہوں کہ خوش رہوں میں

◈

ہنسا اور پھر رو دیا بادشہ
اُسی دن سے ہے لا پتا بادشہ

ہر اِک وقت کے بادشہ سے الگ
یہ دل، ایک بے وقت کا بادشہ

وہ دیوار اپنی جگہ سلطنت
یہ دربان اپنی جگہ بادشہ

پرندوں کی اِک دوسری رہگزر
فقیروں کا اِک دوسرا بادشہ

ہم انصاف خود سے نہیں کر سکے
ترے پاس آنا پڑا، بادشہ

مریں تیرے دشمن، جئیں تیرے دوست
اب اِتنے نہ دشمن بنا بادشہ

زمانوں سے رقصاں ہَوا اور ہم
جھروکے میں بیٹھا ہُوا بادشہ

ہماری تمھاری کہانی فنا
''ہمارا تمھارا خدا بادشہ''

رات میں دن ملائیے
خواب سا کچھ بنائیے

خوابوں کو وقت دیجیے
نیند میں مسکرائیے

میز پہ رکھ دیا ہے سر
پھول کہاں سے لائیے

پڑھنے کا وقت جا چکا
صفحے اُلٹتے جائیے

سجدے کا لطف لیجیے
نبیوں کے دُکھ اُٹھائیے

رات، کسی کی رات ہو
اپنے دیے جلائیے

◈

دل کی آواز سماعت کرلی
دستِ مجذوب پہ بیعت کرلی

اپنی ویرانی سے، دل، دشت ہوا
کچھ نہ کر پائے تو وحشت کرلی

آئنہ سامنے رکھا ہم نے
اور آنکھوں پہ قناعت کرلی

ہم نے پاپوش چھپائے رکھے
اور پیروں کی مرمت کرلی

اپنے خوابوں سے سبکدوش ہوئے
اپنے آگے ہی وضاحت کرلی

ایک گردش کا تصور کرکے
طے زمانوں کی مسافت کرلی

دیر کے بعد خیال آیا ہے
ہم نے اِس عشق میں عجلت کرلی

◈

کچھ خاک سے ہے کام، کچھ اِس خاک داں سے ہے
جانا ہے دُور اور گزرنا یہاں سے ہے

دِل اپنی رائیگانی سے زندہ ہے اب تلک
آباد یہ جہاں بھی غبارِ جہاں سے ہے

بس خاک پڑ گئی ہے بدن پر زمین کی
ورنہ مشابہت تو مری آسماں سے ہے

دِل بھی یہی ہے، وقت بھی، منظر بھی، نیند بھی
جانا کہاں ہے خواب میں، جانا کہاں سے ہے

اِک داستاں قدیم ہے، اِک داستاں دراز
ہے شام جِس کا نام، وہ کِس داستاں سے ہے

وابستہ میز پوش کے پھولوں کی زندگی
مہمان سے ہے، میز سے ہے، میزباں سے ہے

◈

اشک گرتے نہیں ہیں یوں شاید
ہو چکی سیرِ اندروں شاید

میں اُسے دیکھتا رہوں شاید
یوں کنارے سے جا لگوں شاید

لوٹ آیا ہوں سب کے جانے پر
اب کوئی بات کر سکوں شاید

ہر کہانی اداس کرتی ہے
ختم ہونے کو ہے جنوں شاید

خشک ہونٹوں پہ پھیرتا ہوں زباں
سر اٹھاتی ہے موجِ خوں شاید

آ گرا ہوں کسی ستارے پر
منہدم ہو گئے ستوں شاید

روز اِس راہ سے گزرتا ہوں
پھِر کسی کو دِکھائی دوں شاید

ہر پڑاؤ پہ یوں لگا عادلؔ
میں کسی قافلے میں ہوں شاید

◈

سبھی کو دشت سے دریا، جدا دکھائی دیا
ہمیں تو عشق میں سب ایک سا دکھائی دیا

میں آسماں کی طرف دیکھ کر ہنسوں، تو یہ لوگ
یہ پوچھتے ہیں کہ اے بھائی! کیا دکھائی دیا

یہ ایک داغ ہے دل پر، کہ ایک روزن ہے
اِسی سے خواب، اِسی سے خدا دکھائی دیا

کسی نے جھانک کے دیکھا تھا اُس دریچے سے
میں اپنے آپ سے باہر کھڑا دکھائی دیا

بہ طور آئنہ دیکھا جہاں تلک دیکھا
بہ طور عکس تو بس آئنہ دکھائی دیا

لکھا تو اور ہی کچھ تھا کھنڈر کی تختی پر
کچھ ایسے ٹوٹی کہ 'عادلؔ' لکھا دکھائی دیا

◈

گرد کوزوں سے ہٹانے کے لیے آتا ہے
کوزہ گر، شکل دکھانے کے لیے آتا ہے

اشک اِس دشت میں، اِس آنکھ کی ویرانی میں
اِک محبت کو بچانے کے لیے آتا ہے

یوں ترا خواب ہٹا دیتا ہے سارے پردے
جس طرح کوئی جگانے کے لیے آتا ہے

روز اِس کاٹھ کی چھت پر سے گزرتا ہے پرند
جانے کیا یاد دِلانے کے لیے آتا ہے

ایک کردار کی امیّد میں بیٹھے ہیں یہ لوگ
جو کہانی میں ہنسانے کے لیے آتا ہے

ایک کتبے پہ لکھا ہے کہ ذرا ٹھہرو تو
یاں تو ہر شخص ہی جانے کے لیے آتا ہے

دِل کی سرحد پہ کھڑا دیکھ رہا ہوں عادلؔ
کب کوئی ہاتھ ملانے کے لیے آتا ہے

◈

دل میں رہتا ہے کوئی، دل ہی کی خاطر خاموش
جیسے تصویر میں بیٹھا ہو مصوّر خاموش

دل کی خاموشی سے گھبرا کے اُٹھاتا ہوں نظر
ایک آواز سی آتی ہے، مسافر! خاموش

اِس تعارف کا نہ آغاز، نہ انجام کوئی
کر دیا ایک خموشی نے مجھے پھر خاموش

کچھ نہ سُن کر بھی تو کہنا ہے کہ ہاں، سنتے ہیں
کچھ نہ کہہ کر بھی تو ہونا ہے بالآخر خاموش

ڈوب سکتی ہے یہ کشتی تری سرگوشی سے
اے مرے خواب، مرے حامی و ناصر، خاموش

چیونٹیاں رینگ رہی ہیں کہیں اندر عادلؔ
ہم ہیں دیوار کے مانند، بظاہر خاموش

اندروں سے مکالمہ کیجے
چُپ سے بہتر ہے، رولیا کیجے

دل بھی سورج کے ساتھ نکلا تھا
شام ہونے کو ہے دعا کیجے

خال و خد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں
آئنہ دیکھتے رہا کیجے

وقت بھولا ہوا مسافر ہے
اِس کو رستہ بتا دیا کیجے

کِن زمانوں کا عشق ہے دل میں
کِن زبانوں میں تذکرہ کیجے

کس کی دستک پہ کون نکلا ہے
کون مہمان ہے؟ پتا کیجے

اشک جاتا ہے آنکھ سے عادلؔ
کس طرح دوست کو جدا کیجے

اشک گرنے کی صدا آئی ہے
بس یہی راحتِ گویائی ہے

سطح پر تیر رہے ہیں دن، رات
نیند، اِک خواب کی گہرائی ہے

اُن پرندوں کا پلٹ کر آنا
اِک تخیّل کی پذیرائی ہے

عکس بھی غیر ہے، آئینہ بھی
یہ تحیّر ہے کہ تنہائی ہے

اُن دریچوں سے، کہ جو تھے ہی نہیں
اِک اُداسی ہے، کہ در آئی ہے

دِل نمودار ہُوا ہے دِل میں
آنکھ اِک آنکھ سے بھر آئی ہے

اُس کی آنکھوں کی خموشی عادلؔ
ڈوبتے وقت کی گویائی ہے

◈

وقت گزرا ہوا مِلا ہے مجھے
کوئی پہلے سے جانتا ہے مجھے

اپنے آغاز کی تلاش میں ہوں
اپنے انجام کا پتا ہے مجھے

بیٹھے بیٹھے، اِسی غبار کے ساتھ
اب تو اُڑنا بھی آ گیا ہے مجھے

رات جو خواب دیکھتا ہوں میں
صبح وہ خواب دیکھتا ہے مجھے

کوئی اِتنے قریب سے گزرا
دُور تک دیکھنا پڑا ہے مجھے

پھول رکھے ہیں میز پر کس نے
اب یہ دفتر بھی دیکھنا ہے مجھے

ہونٹ ٹکرا رہے ہیں کشتی سے
کوئی پانی پلا رہا ہے مجھے

یہ طلسمِ غمِ جہاں عادلؔ
ٹوٹتا ہے نہ توڑتا ہے مجھے

سفر پہ جیسے کوئی گھر سے ہو کے جاتا ہے
ہر آبلہ مرے اندر سے ہو کے جاتا ہے

جہاں سے چاہے گزر جائے موجۂ اُمیّد
یہ کیا، کہ میرے برابر سے ہو کے جاتا ہے

جنوں کا پوچھیے ہم سے، کہ شہر کا ہر چاک
اِسی دکانِ رفوگر سے ہو کے جاتا ہے

میں روز ایک زمانے کی سیر کرتا ہوں
یہ راستہ مرے بستر سے ہو کے جاتا ہے

ہمارے دل میں حوالے ہیں ساری یادوں کے
ورق ورق اِسی دفتر سے ہو کے جاتا ہے

سنتے ہیں جو ہم دشت میں پانی کی کہانی
آزار کا آزار، کہانی کی کہانی

دریا تو کہیں بعد میں دریافت ہوئے ہیں
آغاز ہوئی دل سے روانی کی کہانی

سنتا ہو اگر کوئی تو عادل وہ در و بام
کہتے ہیں مری نقلِ مکانی کی کہانی

◈

صحراؤں کے دوست تھے ہم، خود آرائی سے ختم ہوئے
اُوپر اُوپر خاک اُڑائی، گہرائی سے ختم ہوئے

ویرانہ بھی ہم تھے، خاموشی بھی ہم تھے، دِل بھی ہم
یکسوئی سے عشق کِیا اور یکتائی سے ختم ہوئے

دریا، دلدل، پربت، جنگل اندر تک آ پہنچے تھے
اِس بستی کے رہنے والے تنہائی سے ختم ہوئے

کتنی آنکھیں تھیں جو اپنی بینائی میں ڈوب گئیں
کتنے منظر تھے جو اپنی پہنائی سے ختم ہوئے

عادلؔ اِس رہداری سے وابستہ کچھ گُل دستے تھے
رُک رُک کر بڑھنے والوں کی پسپائی سے ختم ہوئے

◈

رُک گیا تھا میں کسی تحریک سے
اِک صدا آئی بہت نزدیک سے

ناؤ تھی یا وقت تھا یا خواب تھا
یاد کچھ پڑتا نہیں ہے ٹھیک سے

روشنی اِک تجربہ تھی ورنہ ہم
مطمئن ہیں گوشۂ تاریک سے

اِس خرابی میں یہ خوبی ہے کہ دِل
مضمحل ہوتا نہیں تضحیک سے

◈

دیکھنے والوں کو پہچانیں، اُن کے ساتھ رہیں
رینگنے والے، دوڑنے والوں سے محتاط رہیں

فرش پہ رکھ کر خوابوں، چہروں اور لکیروں کو
ہم کچھ دیر، اجازت ہو تو، خالی ہاتھ رہیں

جینا سیکھیں، مرنا سیکھیں، خوش رہنا سیکھیں
بستی والے، اِس خیمے میں آئیں، رات رہیں

خاموشی سے، بڑھتی فصلیں، جلدی بڑھتی ہیں
تم شہروں کو شور مبارک! ہم دیہات رہیں

رُک کر، رہ کر، اُڑ کر، بہہ کر، چل کر دیکھا ہے
ہر صورت ممکن ہے عادل، دریا ساتھ رہیں

◈

کسی کا خواب، کسی کا قیاس ہے دنیا
مرے عزیز! یہاں کس کے پاس ہے دنیا

یہ خون اور پسینے کی بُو نہیں جاتی
نہ جانے کس کے بدن کا لباس ہے دنیا

ہمارے حلق سے اِک گھونٹ بھی نہیں اتری
بس ایک اور ہی دنیا کی پیاس ہے دنیا

مرے قلم کی سیاہی کا ایک قطرہ ہے
مری کتاب سے اِک اقتباس ہے دنیا

◈

وہ شہر، کسی شہر میں محدود نہیں تھا
اُس میں وہ سبھی کچھ تھا، جو موجود نہیں تھا

گم ہو گئی زنجیر کی آواز میں آواز
افسوس! کہ ہم میں کوئی داؤد نہیں تھا

خاموش کچھ ایسا تھا کہ بس تھا ہی نہیں دل
آباد بس اِتنا تھا کہ نابود نہیں تھا

مقبول نہیں گرچہ، مرے دل کی معیشت
یاں کوئی خسارہ کبھی بے سُود نہیں تھا

چُھو کر اُسے دیکھا تھا، مکرّر نہیں دیکھا
عادلؔ وہ مرا خواب تھا، مقصود نہیں تھا

◈

جانے کیا کیا ہے ترے میرے بیچ
ہاں، یہ ممکن ہے کہ دیوار بھی ہو

یہ جو شہرت ہے بھنور کی اِس پار
کیا ضروری ہے کہ اُس پار بھی ہو

دل میاں! چپ ہی رہو، بہتر ہے
تم اکیلے بھی ہو، بیکار بھی ہو

اِک نفس، نابود سے باہر ذرا رہتا ہوں میں
گمشدہ چیزوں کے اندر لاپتا رہتا ہوں میں

جتنی باتیں یاد آتی ہیں، وہ لکھ لیتا ہوں سب
اور پھر ایک ایک کر کے، بھولتا رہتا ہوں میں

گرم جوشی نے مجھے جُھلسا دیا تھا، ایک دن
اندروں کے سرد خانے میں پڑا رہتا ہوں میں

خرچ کر دیتا ہوں سب موجود اپنے ہاتھ سے
اور ناموجود کی دُھن میں لگا رہتا ہوں میں

جتنی گہرائی ہے عادلؔ، اُتنی ہی تنہائی ہے
بس کہ سطحِ زندگی پر تیرتا رہتا ہوں میں

◈

کھنڈر ہوتے ہوئے گھر کی نشانی
تمنّا، کیا نئی اور کیا پرانی

روانی میں نظر آتا ہے جو بھی
اُسے تسلیم کر لیتے ہیں پانی

کیا ہے احتجاجاً صبر ہم نے
ہماری کشتیاں ہیں بادبانی

اُسے ہم رقص، ہم آواز کرتے
اگر کردار بن سکتی کہانی

◈

ہم جانا چاہتے تھے جدھر بھی، نہیں گئے
اور انتہا تو یہ ہے کہ گھر بھی نہیں گئے

وہ خواب جانے کیسے خرابے میں گم ہوئے
اِس پار بھی نہیں ہیں، اُدھر بھی نہیں گئے

صاحب! تمھیں خبر ہی کہاں تھی کہ ہم بھی ہیں
ویسے تو اب بھی ہیں، کوئی مر بھی نہیں گئے

بارش ہوئی تو ہے مگر اِتنی کہ یہ ظروف
خالی نہیں رہے ہیں تو بھر بھی نہیں گئے

عادؔل زمینِ دل سے زمانے خیال کے
گزرے کچھ اِس طرح کہ گزر بھی نہیں گئے

کچھ نظر آتا نہیں افلاک پر
مطمئن ہیں دامنِ صد چاک پر

یوں اُٹھے، اِک دن، کہ لوگوں کو ہُوا
اَبر کا دھوکا، ہماری خاک پر

رنگ جو پوشاک کا ہے، دِل کا تھا
دِل پہ ہے، جو داغ تھا پوشاک پر

لہلہاتی کھیتیوں سے پُر زمیں
تازیانہ ہے ہماری خاک پر

◈

ہمیں یونہی نہ سرِ آب و گِل بنایا جائے
ہمارے خواب دیے جائیں، دِل بنایا جائے

دکھائی دیتا ہے تصویرِ جاں میں دونوں طرف
ہمارا زخم ذرا مندمل بنایا جائے

اگر جلایا گیا ہے کہیں دیے سے دیا
تو کیا عجب کہ کبھی دِل سے دِل بنایا جائے

شدید تر ہے تسلسل میں ہجر کا موسم
کبھی ملو، کہ اِسے معتدل بنایا جائے

یہ نقش بن نہیں سکتا، تو کیا ضروری ہے
خراب و خستہ و خوار و خجل بنایا جائے

◈

اے شہرِ خواب! اور بھی کچھ ہے یہاں کہ بس
میں مان لوں کہ یہ مرے جانے کا وقت ہے

الجھی ہوئی ہو ڈور، تو کیا شام، کیا ہَوا
دِل میں مگر پتنگ اُڑانے کا وقت ہے

یہ اعتراف آخری کوشش ہے، اور بس
جتنا بچا ہے خود کو بچانے کا وقت ہے

عادلؔ کہانیوں سے مدد مانگتا ہوں میں
جو ہو نہیں سکا وہ بتانے کا وقت ہے

◈

ترکِ دنیا بھی نہیں کر سکتے
خود سے جھگڑا بھی نہیں کر سکتے

لوگ تو عشق میں مر جاتے ہیں
ہم تو ایسا بھی نہیں کر سکتے

اُن گزارے ہوئے لمحوں کے بغیر
ہم گزارا بھی نہیں کر سکتے

ہم تو جلتے بھی نہیں ہیں عادلؔ
اور سایہ بھی نہیں کر سکتے

(ادریس بابر کے لیے)

◈

کوزہ گر! تیرے نہ چھونے سے یہی خاک کا ڈھیر
رفتہ رفتہ کسی تربت میں بدل جاتا ہے

اِک نظر دیکھنا، ہارے ہوئے لشکر کی طرف
ایک دن، مالِ غنیمت میں بدل جاتا ہے

آنکھ ہنستی ہے تو ہنستی ہی چلی جاتی ہے
پھر یہ رونا بھی ضرورت میں بدل جاتا ہے

◈

ہوئی آغاز پھولوں کی کہانی
وہ پہلا دِل، وہ پہلی خوش گمانی

اُداسی کی مہک آتی ہے مجھ سے
مری تنہائی ہے اِتنی پرانی

ہمیں دونوں کنارے دیکھنے ہیں
توجّہ چاہتی ہے یہ روانی

یہ بارش اور یہ پامال سبزہ
نمو پاتی ہوئی اِک رائیگانی

محبت ہوگئی اِک روز عادل
ہمارا مشغلہ تھا باغبانی

◈

شب بھر، یہ ہم تھے اور وہ ماہِ تمام تھا
دِل نے جو کر دیا ہے، سمندر کا کام تھا

دریا تو اپنی موج میں جانے کہاں گیا
دِل میں وہ پھول ہے جو کناروں پہ عام تھا

رنجِ سفر میں ایک سے تھے، دشت و آبجو
رستے میں جو بھی تھا، وہ دعا کا مقام تھا

عادلؔ، اِس ایک چاکِ دلِ مضطرب سے قبل
کارِ رفوگری میں ہمارا بھی نام تھا

◈

وہ کہیں تھا کہ نہ تھا، فرض کریں
اُس دریچے کو کُھلا فرض کریں

کوئی بھی چیز جلا کر گھر کی
دِل میں آتا ہے، دِیا فرض کریں

در و دیوار سے ہٹ کر کسی روز
گھر، کوئی اور جگہ فرض کریں

نیند کو نیند میں کیا سمجھیں ہم
خواب کو خواب میں کیا فرض کریں

ہم سے دِل ہی نہیں ثابت ہوتا
آپ آئیں تو ذرا فرض کریں

ترے ادراک سے پہلے کہاں تھا
میں اپنی خاک سے پہلے کہاں تھا

دیے میں آگیا ہے جو تمدّن
وہ گھر کے طاق سے پہلے کہاں تھا

پرندے میں سکونت کا ارادہ
خس و خاشاک سے پہلے کہاں تھا

◈

یوں جو پلکوں کو مِلا کر نہیں دیکھا جاتا
ہر طرف ایک ہی منظر نہیں دیکھا جاتا

کام اتنے ہیں بیابانوں کے، ویرانوں کے
شام ہو جاتی ہے اور گھر نہیں دیکھا جاتا

جھانک لیتے ہیں گریباں میں، یہی ممکن ہے
ایسی پستی ہے کہ اُوپر نہیں دیکھا جاتا

جس کو خوابوں کی ضرورت ہو، اٹھا کر لے جائے
ہم سے اب اور یہ دفتر نہیں دیکھا جاتا

◈

پھر کیوں واپس لوٹ گئے ہیں، گھر کو آتے آتے ہم
کوئی سمجھنے والا ہوتا، دِل کو کیا سمجھاتے ہم

خوابوں کی آباد گلی میں حسرت تھی، حیرانی تھی
کس کس در پہ دستک دیتے، کس کس کو بلواتے ہم

اَن دیکھی کو دیکھ رہے تھے اور دکھائی دیتے تھے
کھو جانے والوں کو عادلؔ، کھو جاتے تو پاتے ہم

◈

تم مرا خواب تھے، خیال آیا
جانے کیا دیکھ کے خیال آیا

ہجرتیں سب پہ فرض تھیں لیکن
سب سے پہلے مجھے خیال آیا

وہ سفینے کہاں گئے ہوں گے
ڈوبتے ڈوبتے خیال آیا

راستے کھا گئے اُسے عادلؔ
لوٹنے کا جسے خیال آیا

◈

شاخِ دل، اب بھی ہری ہو جیسے
کوئی تصویر گری ہو جیسے

سرسری دیکھ رہے ہیں دنیا
نیند، پلکوں پہ دھری ہو جیسے

خواب اِتنے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے
حالتِ دربدری ہو جیسے

بے پر و بال اُڑا جاتا ہوں
ساتھ میں کوئی پری ہو جیسے

◈

جتنا آب و دانہ ہے
اُتنا ہی ویرانہ ہے

ہم نے اپنی نیندوں کو
خوابوں سے پہچانا ہے

باغ کا تربت ہو جانا
پھولوں کا اُٹھ جانا ہے

زخموں کی گہرائی بھی
وحشت کا پیمانہ ہے

گھر کے خالی کمروں میں
میرا ایک گھرانہ ہے

◈

زوالِ آفتاب دیکھیے
ذرا مری کتاب دیکھیے

ہماری جستجو نہ پوچھیے
زمیں پہ نقشِ آب دیکھیے

یہی کِیا کہ خاک اوڑھ لی
ہمارا احتساب دیکھیے

چراغ جل کے راکھ ہو گیا
ہوا کا اجتناب دیکھیے

◈

اپنی چھت پر اُداس بیٹھا ہوں
میں پرندوں کے پاس بیٹھا ہوں

دن کی چوکھٹ پہ، شب کے قدموں میں
صورتِ التماس بیٹھا ہوں

آخری پیرہن ادھورا ہے
اُگ رہی ہے کپاس، بیٹھا ہوں

کھو گیا ہے کہیں بدن عادلؔ
لے کے اپنا لباس، بیٹھا ہوں

◈

اپنی پہچان بھول جاتے ہیں
اپنی پہچان کے لیے، ہم لوگ

کوزہ گر کی دکاں ملی ہی نہیں
خاک ہی چھانتے رہے ہم لوگ

پھر بہت یاد آئیں گے صاحب!
گر تمھیں یاد رہ گئے ہم لوگ

◈

ہمارا خاک ہو جانا بظاہر
نظر آتا ہے افسانہ بظاہر

جنم لیتی ہے ہر تاریخ دل سے
بہت خالی ہے یہ خانہ بظاہر

مرے اندر کی خاموشی کے ڈر سے
چھلک اُٹّھا ہے پیمانہ بظاہر

تری بے خوابیوں کا خواب ہوں میں
تماشا ہے مرا آنا بظاہر

◈

اندر سے بھلا دیا گیا ہوں
تاریخ بنا دیا گیا ہوں

مجھ پر تھے ہزار خواب کندہ
قصوں میں چلا دیا گیا ہوں

خاموش کھڑا تھا راستے میں
نقشے سے مٹا دیا گیا ہوں

سرگوشی کا منتظر تھا عادلؔ
اور دُور بٹھا دیا گیا ہوں

◈

تو نہیں ہے تو دوست کیا غم ہے
دل میں تیری جگہ ترا غم ہے

دل میں جو زہر ہے وہ زہر نہیں
مدتوں کا رُکا ہوا غم ہے

زخم مائل بہ اندمال نہیں
اور یہ غم زخم سے بڑا غم ہے

اس سے مل کر مجھے خوشی ہوگی
اس کے دل میں ابھی مرا غم ہے

کھولیے دل کی ڈائری عادلؔ
دیکھیے آج کون سا غم ہے

شجاع آباد

اسٹیشن پر آتی جاتی گاڑی کی آواز
جیسے اگلی پچھلی، ساری، صدیوں کی ہمراز

نامقبول دعاؤں جیسے بڑھتے یکّہ بان
اور مسافر آنے والے، جیسے رب کا دھیان

ٹوٹی پھوٹی، اونچی نیچی، ناہموار سڑک
گزرے وقت کی گرد پڑی ہے جس پہ دُور تلک

پھاٹک والے موڑ سے آگے، رستے میں اک نہر
جس میں اکثر لہراتی ہے ویرانی کی لہر

رنگ برنگی آنکھوں والے دُور دراز کے لوگ
ایک شفاخانہ آنکھوں کا، اور ان دیکھے روگ

ایک احاطے میں بیٹھے ہیں ڈھیروں ڈھیر وکیل
اِن کے خوابوں کا حلقہ ہے تھانہ اور تحصیل

اُستادوں کی پیشانی پر اِک جیسی تحریر
اِس تحریر سے وابستہ ہے بچوں کی تقدیر

قبرستان کے اِک کونے پر گورکنوں کے گھر
موت اِنھیں زندہ رکھتی ہے، مٹی اِن کا زر

ساری آوازوں کا مخزن، چوراہے کا شور
لمحہ لمحہ بھیس بدلتا وقت، ازل کا چور

ٹھیلے والے دُکّانوں کی حسرت میں پامال
دن بھر ساتھ لیے پھرتے ہیں، سودا اور سوال

چاروں دروازوں کے اندر، اندر کا اسباب
ایک فصیل پرانی، جیسے اک بوڑھے کا خواب

(ایک نامکمل نظم)

ناموجود کی دُھن میں

(فرد فرد)

ہم سے گِریہ مکمل نہیں ہو سکا
ہم نے دیوار پر لکھ دیا معذرت

کِس کو ٹھہرائیے ٹوٹی ہوئی چیزوں کا امیں
اپنی لُکنت کا سبب کِس کی زبانی کہیے

یہ آدمی، مری نظروں میں پست کیسے ہُوا
کِسے بتاؤں کہ میں سگ پرست کیسے ہُوا

میرے آنگن میں وہ شجر ہی نہیں
جو پرندوں کا خواب ہوتا ہے

سبھی اپنی کہانی کہہ رہے ہیں
الاؤ جل رہا ہے خامشی سے

کچھ پرندوں کو یہ معلوم نہیں تھا عادلؔ
جل رہا ہو تو شجر چھوڑ دیا جاتا ہے

سمجھ کہ تھے ہی نہیں خواب دیکھنے والے
بھلا ہُوا کہ میں بازار سے نکل آیا

اگر گزار لیں یہ لمحۂ محبت
تو کیا ہمیں کوئی زمانہ مل سکے گا

موسمِ اندمال آتا ہے
زخم پر بھی زوال آتا ہے

یہ اشک نہیں ہے اشک، عادلؔ
اِک طرزِ کلام ہے ہمارا

اِک ذرا روشنی میں لاؤ اِسے
دیکھتے ہیں، دیا بجھا کیوں ہے

دشت و دریا کی ابتدا سے ہیں
ہم وہی تین دن کے پیاسے ہیں

ہم ستارے شمار کرتے ہیں
اور دیے انتظار کرتے ہیں

اجنبی کی حیثیت سے ذوالفقارؔ عادل، ہمیں
جانتے ہیں سب کے سب اِس کارواں کے اجنبی

کہاں لے جائیں اِس موہوم سی موجِ تبسم کو
ہماری خوش گمانی سے تم اِتنے بدگماں کیوں ہو؟

نہ اوّلیں، سرِ منظر، نہ آخریں ہم ہیں
بس اِک غبار ہے، جس میں کہیں کہیں ہم ہیں

دشت کی سمت سے جنگل میں پہنچتا دریا
آگے بڑھ جاتا ہے پیڑوں کو نصیحت کر کے

جب ٹھہرتا نہ ہو کہیں کچھ بھی
دل میں رہ جائے تو خدا اچھا
شہر میں وہ دکان ڈھونڈتے ہیں
زخم سِلتا ہو جس جگہ اچھا

وہ چراغوں کو جلانے کا ہنر جانتا ہے
ہاں مگر لیتا نہیں اُس سے کوئی کام ابھی
تیز آندھی میں کسی جلتے دیے کی صورت
میرے ہونٹوں پہ لرزتا ہے ترا نام ابھی

راحتِ گریہ و زاری پہ قناعت کر لے
دیکھ، اِس خوابِ گریزاں میں نہ کر اور سفر

وسعتِ خواب! ہمیں اور کہاں جانا ہے
ایک گردش میں سمٹ آئے ہیں گھر اور سفر

بس یہی ہے کہ کنارہ نہیں ملنے والا
ورنہ اِس موج میں کیا کیا نہیں ملنے والا

بس اِسی خوابِ محبت پہ قناعت کیجئے
اب کوئی اور اشارہ نہیں ملنے والا

جانے والے لوٹ کر آتے نہیں
ہم ہی تھے جو آ گئے بارِ دگر
وہ مری پہلی دعا کا کیا ہُوا؟
ہاتھ اُٹھاؤں کس لیے، بارِ دگر

پہلے کہاں تھے ہم میں اڑانوں کے حوصلے
یہ تو قفس میں آ کے ہمیں بال و پر لگے

دیکھ یوں آنکھ نم نہیں کرتے
جانے والوں کا غم نہیں کرتے
دل میں جلتے ہوئے چراغ کی لو
روشنی میں بھی کم نہیں کرتے

راستہ ڈھونڈ کے لایا ہے مجھے
آبلہ دیکھنے آیا ہے مجھے
اشک دیکھا ہے تری آنکھوں میں
تب کہیں ڈوبنا آیا ہے مجھے

ہر ستارے کی جگہ ہے دل میں
ایک نایاب خلا ہے دل میں
شام کے وقت یہ کس نے عادل
دن کا آغاز کِیا ہے دل میں

چلنا ہے روشنی کے سفر پر، تو آیئے
پہلے شکستہ طاق سے باہر تو آیئے
کہتے نہیں ہیں ہم تو دِکھاتے ہیں داستاں
سب کچھ بدل گیا ہے، کبھی گھر تو آیئے

کیا خبر تھی کہ یہ باہر سے کھنڈر لگتا ہے
ہم کبھی گھر کے در و بام سے نکلے ہی نہیں
مطمئن میرے بدن سے کوئی ایسا تو نہ تھا
جیسے یہ تیر ہیں، آرام سے نکلے ہی نہیں

ہم تری آگ یونہی ساتھ لیے پھرتے ہیں
دل میں رکھی بھی نہیں، دِل سے نکالی بھی نہیں
شجرِ عشق پہ اُترے ہیں پرندے کیا کیا
اور یہ تصویر کوئی ایسی خیالی بھی نہیں

کسی دیوار پہ نظریں تو جما کر بیٹھو
ورنہ تا حشر نہیں نقش اُبھرنے والے
آج لبریز ہُوا جاتا ہے پیمانۂ صبر
عین اُس وقت کہ جب زخم ہیں بھرنے والے

اِک ایسی سمت کی، اِک ایسے زاویے کی تلاش
جہاں سے ہو سکے ممکن کسی دیے کی تلاش
ہمارے ساتھ کہاں تک ہے راستہ عادلؔ
اور اس کے بعد کہاں تک ہے راستے کی تلاش

ایک ٹھکانا مل ہی جاتا لیکن ہم
ایک دِیا اور ایک ٹھکانہ چاہتے ہیں
گذرے وقت کو یاد کریں اب وقت کہاں
کچھ لمحے تو ایک زمانہ چاہتے ہیں

اس برگِ آخریں پہ ابھی مضمحل نہ ہو
ممکن ہے اس کے بعد کوئی پھول کھلنا ہو
ملیے کہ پھر نہ جانے کہاں کے غبار میں
کن وحشتوں میں، کون سے دشتوں میں ملنا ہو

ہم اگر عالمِ امکان سمجھنے لگ جائیں
ان ستاروں کو بھی سامان سمجھنے لگ جائیں
بند کمروں کی خبر لو کہ بہت ممکن ہے
آنے والے ہمیں مہمان سمجھنے لگ جائیں

ہمیں کچھ کام ایسے پڑ گئے ہیں
دیے گھر کے بجھانے پڑ گئے ہیں
میں اِن سے بھاگتا پھرتا ہوں عادلؔ
سفر کچھ ایسے پیچھے پڑ گئے ہیں

وہ جو معدوم ہے، معدوم نہیں
کون سا وقت ہے، معلوم نہیں
ہم ہیں بند آنکھوں پہ رکھے ہوئے خواب
ہم سے غافل ہے وہ محروم نہیں

میں نے دیکھا ہی نہیں تھا ترے در سے آگے
میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کدھر جاؤں گا
میرے لہجے میں ہی خوشبو ہے، ہَوا! تیز نہ چل
میں کوئی پھول نہیں ہوں کہ بکھر جاؤں گا

اور اِس کے بعد اِک ایسے ہی لمحے تک ہے خاموشی
ہمیں درپیش پھر سے لمحۂ تجدیدِ وعدہ ہے
سنو! رستے میں اِک جلتا ہوا صحرا بھی آئے گا
کہو! کب تک ہمارے ساتھ چلنے کا اِرادہ ہے

پربت پہ ابر، ابر میں بھیگے ہوئے درخت
بارش سے بے نیاز، فرشتے ہوئے درخت
شاخوں کو نام دے کے تماشا بنا دیا
جیسے کسی درخت پہ اُگتے ہوئے درخت

ہم چاہیں تو اس کو ڈھونڈ بھی سکتے ہیں
خوابِ گزشتہ میں جا کر آئندہ بھی

کبھی رخ نہ کرتے کسی کی طرف
اگر دیکھتے اپنے جی کی طرف
نظر بھی تنفس کا دیتی ہے کام
ذرا دیکھیے تو کسی کی طرف

صبا صبا سے الگ ہے، قفس قفس میں نہیں
یہ دسترس بھی عجب ہے کہ دسترس میں نہیں

بارش ہونے والی ہے

(مضامین)

- ظفر اقبال ظفر
- شجاع الدین احمد
- نوید صادق
- ذوالفقار عادل

آخری شب ہوں، شہرزاد
میں تجھے کیوں نہیں ہوں یاد

سایہ بھی لیے پھرتا ہے ہمراہ، سفر بھی
دل ابر کے مانند پرندہ بھی، شجر بھی

ریاضتوں کے ہولناک سنّاٹے میں تحیّر کی چیخ

اَدب کیا ہے، کیا نہیں ہے...... اِسے کیا ہونا چاہیے؛ یا شاعری کے داخلی اور خارجی محرکات کا تعیّن کرنے کے لیے ہمیں کون سی شعری اَقدار کو مدّ ِنظر رکھنا چاہیے...... میں اِس بحث میں اُلجھنے کا قائل ہی نہیں ہوں کیونکہ جہاں اِس طرح کے مباحث شروع ہو جائیں، وہاں شاعر اور اُس کی شاعری دونوں خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ عام طور پر رائے زنی کے شوق میں ہم اِتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ شاعر کی شخصیت اور اُس کا فن دونوں، ہماری لفظی بازی گری کے مہلک رویّوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ہمیں شاعر کے لہجے کی توانائی اور خیالات کی شگفتگی دِکھائی نہیں دیتی اور ہم اپنے بے ربط جملوں کو ثقیل اور بوجھل لفظوں کی بیساکھی کے ذریعے ایک پُرتکلف اِختتام تک گھسیٹتے چلے جاتے ہیں جبکہ شاعری الفاظ کی سطح پر نہیں، الفاظ کی تہہ میں بہہ رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی کافی ہے کہ سیدھے سبھاؤ شاعر کے شخصی پہلوؤں اور اُس کے فن کی موضوعاتی جہتوں کو زیرِ بحث لایا جائے۔

ذوالفقار عادل کو میں اُتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ بیس پچیس سالہ رِفاقت میں مجھے جاننا چاہیے تھا۔ اور جب جاننے کا مرحلہ طے ہو جائے تو پھر سمجھنے کا معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں کسی قدر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ذوالفقار عادل کو جاننے اور سمجھنے میں کبھی شعوری کوتاہی نہیں کی۔ اِس کا فائدہ یہ ہوا کہ جب عادل نے برسوں کی حرف ریزی اور سوچ بچار کے بعد اچانک کہا کہ ''شرق مرے شمال میں''، تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی...... اِس لیے کہ میں اُس کی شعری ریاضت کے ہر لمحے کا گواہ ہوں!

مجھے معلوم ہے کہ ذوالفقار عادل، آدابِ برہنہ پائی سے کس قدر واقف ہے...... سوچوں کے پُرہول سنّاٹے میں چلتے چلتے' کرب و احساس کے آبلوں سے لہو کی کوئی چھینٹ اُس کے دریدہ دامن تک نہیں آتی۔ اُس کے نوکِ قلم کی روانی میں غبارِ رہ گزر کا کوئی ذرّہ حائل نہیں ہوتا۔ حرف و اَلفاظ کے دشتِ خارزار میں اُس کے تخیل کے قدم لڑکھڑا نہیں جاتے۔ وہ گردوپیش کے حالات کی بکھری ہوئی کرچیوں کو نمناک پلکوں سے چننے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ اپنے لہجے میں ہواؤں کی سرسراہٹ اور خوشبوؤں کی سرگوشی سمیٹ لینے کا فن جان

چکا ہے۔ وہ اپنے کسی بھی مضطرب خیال کی دستک سے اپنی خواب گزیدہ شب کو جگا سکتا ہے۔ اُسے روح کے گھاؤ پر ضبط کا ہنر بھی آتا ہے۔ اُس نے کبھی کسی اَعصاب شکن اِنتظار میں مایوسی سے مات کھا کر اَپنی آنکھیں موند لینے کا ناقابلِ تلافی جرم بھی نہیں کیا۔ میں نے کہا نا...... کہ میں اُس کی شعری ریاضت کے ہر لمحے کا گواہ ہوں! اِس لیے جب اُس کی "تحیر آفریں آواز میری سماعت سے ٹکرائی کہ ''شرقِ مرے شمال میں''، تو مجھے اُس کے استعجاب پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ حرف وخیال سے حیران کر دینے کا عادی ہے۔

ذوالفقار عادل کی شخصیت کا قالب ''ایک'' ضرور ہے لیکن اُس کی تہوں میں ایک افسانہ نگار، ایک ڈراما نویس، ایک اداکار اور ایک رَعنا و توانا شاعر، سب بیک وقت سانس لے رہے ہیں۔ تب سلیم اختر قریشی کا کہنا بالکل بجا ہے کہ ذوالفقار عادل، اکیلا اپنے وجود کے اُن پناہ گزینوں کو لیے اِظہار کی مسافتیں طے کر رہا ہے۔ اکیلی جان اور ایسی سخت ریاضت اور کڑا اِمتحان......

''شرق مرے شمال میں'' ایک شعری بیاض کا عنوان ہی نہیں، یہ ریاضتوں کے ہولناک سنّاٹے میں تحیّر کی وہ چیخ ہے جسے آپ نے بھی سُنا اور میں نے بھی: سماعتوں کا اِمتحان درپیش ہے اور صداقتوں کی میزان ہاتھوں میں ہے...... کسی تخلیق کا معیار جانچنے کے لیے بصارت اور بصیرت کی کسوٹی کافی ہے۔ ہمارے چاروں طرف حرف وتخیل میں گندھے لہجہ و اِظہار کی یلغار ہے۔ میں حد درجہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اِن اَن گنت لہجوں کے ہجوم میں ذوالفقار عادل کا پیمانۂ اِظہار، دُوسروں سے قطعی مختلف اور تحیّر آفریں ہے کیونکہ اُس کے اِظہار پر کسی کے لہجے کی چھاپ موجود نہیں؛ اُس کے لفظوں پر کسی حرف ساز کی پرچھائیں نہیں پڑتی؛ اُس کے خیالات پر کسی کی تخیل آفرینی کا توارُد نہیں ہوتا...... جو شخص حد درجہ محتاط ہو کر سوچتا ہو اور اِنتہائی عالمِ ہوش میں لکھتا ہو، وہ کسی کا فکری مقروض رہنا کیونکر پسند کرے گا! ذوالفقار تو شعری ریاضت کا وہ عادل مسافر ہے جس نے اپنے قصور کی گٹھڑی کبھی کسی اَور کے سر پر نہیں رکھی...... وہ نہایت سادگی سے کہہ اُٹھتا ہے کہ:

کس کو ٹھہرایئے ٹوٹی ہوئی چیزوں کا امیں
اپنی لکنت کا سبب کس کی زبانی کہیے

ظفر اقبال ظفر
شجاع آباد

ذوالفقار عادل ......ایک ہمہ جہت شخصیت

ایک مدت ہوئی، جب ذوالفقار عادل نے اپنے کلام کا مسوّدہ اِس فرمائش کے ساتھ میرے حوالے کیا تھا کہ اُن کی کتاب کے لیے ایک تحریر لکھ دُوں۔ میں نے بہت وقت اِس اُمید پر گزار دیا کہ میری ہٹ دھرمی سے مایوس ہوکر، وہ اپنی خواہش سے دست بردار ہو جائیں گے۔مگر وہ ایک طویل راستے پر میرے پیچھے پیچھے چلتے رہے......حتیٰ کہ مجھے قلم اُٹھانا ہی پڑا۔

اِس تمہید سے یہ عندیہ دینا ہرگز مقصود نہیں کہ میرا تساہل کسی طرح سے کوئی منفی اِظہاریہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نہ تو کوئی مصنف ہوں، نہ مترجم، نہ نقاد، نہ شاعر......اَدب سے میرا تعلق بس اِتنا ہے کہ بزرگوں کا اَدب کرتا ہوں۔ میرے اَور میرے ہم پیشہ لوگوں کے لیے اقبال نے کہا تھا:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

ذوالفقار عادل، جن کا حلقہ اُن کی دِلآویز شخصیت کی وجہ سے خاصا وسیع ہے، کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ میں نے جب سے اُنھیں جانا ہے، مختلف رُوپ میں دیکھا ہے۔ پیشہ ورانہ مہارت سے ہٹ کر فنونِ لطیفہ کی ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اُن کی فطرت میں تغیّر کو کچھ زیادہ ہی ثبات ہے، جس میں کہیں تیزی ہے، کہیں دھیما پن۔ اِسی وجہ سے وہ دُوسروں سے ممتاز دِکھائی دیتے ہیں۔ اقبال نے اِس

کیفیت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

فطرت مری مانندِ نسیمِ سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ، کبھی تیز

عادل کی شاعری، اُن کی طبیعت کی طرح ہے۔ اِظہار میں کہیں وسعت ہے اور کہیں ذات کا دُکھ شعروں میں ڈھل جاتا ہے۔ اُن کی شاعری فکر کی ایک نئی راہ کی نشان دہی کرتی ہے۔ سہل اَنداز لیے اُن کا شعر، قاری کی توجہ اپنی طرف ضرور کھینچتا ہے۔

عادل کی غزل میں کہیں خودی کا تصوّر حاوی نظر آتا ہے تو کہیں اِنکسار اُنھیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے:

چراغ جل کے راکھ ہو گیا
ہَوا کا اِجتناب دیکھیے

لیجیے، رات کاٹ دی ہم نے
اب کسی دن کی ابتدا ہو جائے

مرے قلم کی سیاہی کا ایک قطرہ ہے
مری کتاب سے اِک اقتباس ہے دنیا

اور یہی تضاد اُن کی زِندگی میں بھی دِکھائی دیتا ہے۔ صبح شام مشینوں سے نبرد آزما شخص، فرصت کے لمحات میں فنونِ لطیفہ میں سرشار نظر آتا ہے، اور شاعری میں احساسات کا ایسا رچاؤ کہ مشینوں کی حکومت اور احساسِ مروّت کے حوالے سے اقبالؔ کے فلسفے کی تردید ہوتی نظر آتی ہے۔

شجاع الدین احمد

جون ۲۰۱۴

گھور رہا ہوں تالے کو!!

(ایک طویل مضمون سے اقتباس)

ذوالفقار عادل 1990ء کے بعد سامنے آنے والے شعرا میں سے فنی و فکری ہر دو اعتبار سے منفرد ممتاز بھی ہے اور تخلیقی لحاظ سے اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں سے غزل اپنے مجموعی محاسن کے ساتھ قاری پر اپنا نقش جماتی ہے۔ سو یہ کیسے ممکن ہے کہ آج کا کوئی بھی باشعور نقاد اس کے مقام و مرتبہ سے انکار کا مرتکب ہو۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ دھیمی لے اور نرم لہجے کا شاعر ہے۔ دوم یہ کہ اُس نے علمی مطالعے سے زیادہ سماجی و تخلیقی نتائج پر منتج ہونے والے مشاہدات سے زیادہ سیکھا ہے۔ اور یہ خوبی ہی کسی شعر کو ''یک شعرے دل آویزے'' کی خوبی سے متصف کرتی ہے، پُراثر بناتی اور شعریت کے برگ و بار کو تازہ رکھتی ہے۔ اگرچہ علمی مطالعہ، بلند فکری کے لیے ضروری ہے، مگر اکثر یوں ہوتا ہے کہ مطالعے کے زور پر کی گئی شاعری تخلیق کی اثریت کو کم تر کر دیتی ہے۔ ذاتی تجربہ و واردات ہی سے پُرتاثیر شعر کی نمود ممکن ہے۔ یہاں کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ذوالفقار عادل نے محض ذاتی واردات و مشاہدات ہی کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ مطالعہ اُس کے ہاں بھی اتنا ہی ضروری رہا ہے جتنا کہ ایک شاعر کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔

ذوالفقار عادل کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُسے پڑھ کر آپ اُداس نہیں ہو سکتے، اور کیفیت کے لحاظ سے زیادہ خوش بھی تو نہیں ہوتے۔ ایک درمیان کی کیفیت ہے۔ ایک ہلکا ہلکا درد ہے جسے اسلوب کی سادگی اور خوش بیانی سے ایک خوش کن کیفیت کے

درجے پر فائز کر دیا گیا ہے۔ اس کا اسلوب بیک وقت عقلی اور جذباتی سطحوں کو متاثر کرتا ہے۔

ذوالفقار عادل کی شاعری کا بنیادی وصف مکالمہ ہے۔ مکالمہ اور پھر مکالمہ۔ جو زیادہ تر اپنے آپ سے چلتا ہے۔ یعنی خود کلامی۔ اس خود کلامی میں ایسے سوالات اٹھائے جاتے ہیں، جن کا جواب بھی اس مکالمے کے اندر موجود ہوتا ہے۔ جواب آمیز ایسے استفسارات جو ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ اس کی سوچ اور طرزِ احساس کن سمتوں کی طرف مائل ہیں۔ آخر سوال اٹھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کا اندازہ بھی ان سوال و جواب پر مبنی اشعار سے لگانا ہوگا، کہ شاعر کے فی الوقت دستیاب کلام میں اس کے آغاز کی بابت کوئی اشارہ نہیں ملتا، ہاں ان سوالات اور سوالیہ لہجے کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ مخصوص آدرشوں کے ٹوٹنے کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوسکتا ہے۔ بعض اوقات سوالات کی نوعیت محض کسی مشاہدہ کے نتیجہ میں سامنے آتی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس مشاہدے میں شاعر خود ہی اس کا معنی خیز جواب بھی فراہم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ سوال میں جواب کی بذاتِ خود موجودگی شاعر کے ہاں غور و فکر اور بتدریج مشاہداتی عمل کی بصیرت افروز موجودگی کا پتہ دیتی ہے اور یہ بات محض چند اشعار تک محدود نہیں، ایک لامحدود دنیا ہے۔ کس کس کا انتخاب کیا جائے؟

ہم کتاب میں شامل ''معذرت'' کی ردیف والی غزل کو ذوالفقار عادل کی شاعری میں ایک اہم موڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ غزل زندگی کے ایک محاذ پر شکست کے اعتراف کا انتہائی ایماندارانہ اظہاریہ ہے۔ زمین سے معذرت، خدا سے معذرت، ہنسنے رونے پر معذرت، اپنے آپ کو بچا نہ سکنے پر، اپنے آپ سے معذرت، اپنی آدرشوں سے معذرت۔ معذرتوں کا یہ پلندہ، دراصل شاعر بل کہ یوں کہیے کہ انسان کی طرف سے معذرت ہے۔ شکست کا لازمی نتیجہ اوّل اوّل تو ایک گہری خاموشی ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ خاموشی بھی آخر کتنے دن کی؟ کہ اندر ہی اندر کہیں کچھ ٹوٹ گیا ہوتا ہے، ایک ہل چل بپا ہوتی ہے۔

ذوالفقار عادل کی شاعری میں شدتِ احساس کی بھرپور صورت ملتی ہے۔ ردِعمل سامنے آتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے شاعر کے ہاں، اس سب پر ردِعمل کس شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ شکوے گلے، رونا دھونا، چیخ پکار، زندگی اور دنیا سے بے زاری، باغیانہ روش، زندگی اور دنیا کی طرف نفرت آمیز رویہ، زندگی اور دنیا سے فرار یا پسپائی۔۔۔ جی نہیں

ذوالفقار عادل کے ہاں ایسا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آتا۔۔۔۔لیکن ردِعمل کی کچھ مزید صورتیں جیسے کہ میرؔ اور سوداؔ کے ہاں ہمیں علی الترتیب حزن اور شدید جھنجھلاہٹ کی شکل میں ملتی ہیں۔خواجہ میر دردؔ کے ہاں ردِعمل کی سب سے احسن صورت یعنی صلح و آشتی اور راضی بہ رضا نظر آتی ہے۔ درپیش صورتِ حال پر ردِعمل کی صورت اور شدت کا انحصار بڑی حد تک شاعر کی شخصیت کے مرہونِ منت ہے۔ہم میرؔ،سوداؔ اور دردؔ کی شخصیات کے بارے میں صرف وہی کچھ جانتے ہیں جو ہم نے ان کے سلسلہ میں پڑھ رکھا ہے لیکن ذوالفقار عادل کو تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کی شخصیت میں جو صلح و آشتی اور محبت بھری ہوئی ہے، وہی اُس کے اشعار میں بھی سامنے آتی ہے۔

شخصی ردِعمل کی اس صورت میں انسان معاشرت سے دور اور فطرت کے نزدیک ہو جاتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر شاعر اشاروں کنایوں پر مبنی بیانیہ اظہار سے دو قدم آگے بڑھ کر اپنے اردگرد دیکھتا ہے، مظاہرِ فطرت پر دھیان دیتا ہے۔ یہ ایک طرح سے داخل سے خارج کی طرف اُڑان ہوتی ہے۔ مظاہرِ فطرت کا یہ گہرا مشاہدہ لاشعور میں موجود تلخیوں کے ساتھ آمیز ہو کر جب شعر کی صورت دھارتا ہے تو استعارات جنم لیتے ہیں، علامات بنتی ہیں، محاکات تشکیل پاتے ہیں۔

دنیا بھر کی شاعری میں استعارات و علامات کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ ہمارے ہاں اردو ادب میں بھی اس ضمن میں خاصا کام ہوا ہے۔علامات کی معاشرتی حیثیت بھی ہوتی ہے اور تاریخی بھی لیکن بہت سی علامات ایسی بھی ملتی ہیں جن کا نہ تو تاریخ سے کوئی معنوی ربط ہوتا ہے اور نہ ہی کسی مخصوص معاشرت سے۔ ناقدین ایسی علامات کو آفاقی علامات قرار دیتے ہیں۔شہر، رات، دریا، صحرا، موسم، چاند، تارے، سورج وغیرہ علامات کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آفاقی علامات ہمیں ہر معاشرے، ہر عہد کے شعرا کے ہاں بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یہ محض ان علامات کے استعمال کرنے والی شخصیت، ان کے طریقِ استعمال اور متعلقاتِ علامت ہی کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ٹھہرتی ہیں۔ یہیں شاعر کا ایک اپنا اسلوب وضع ہوتا ہے۔ یوں تو شخصی یا نجی علامات کی بھی اپنی ایک الگ حیثیت ہوتی ہے لیکن قصہ کچھ یوں ہے کہ جو علامات سعدیؔ و حافظؔ کے ہاں شخصی یا نجی علامات ٹھہریں، وہی کثرتِ

استعمال کے باعث میرؔ تک آتے آتے یا تو آفاقی علامات کا روپ دھار گئیں یا محض ''اشارہ'' کے درجے پر فائز ہو کر رہ گئیں۔ علامات کا ایک ہی معانی میں بار بار استعمال ہونا اسی پر منتج ہوتا ہے۔تاہم زیرک شعرا کے ہاں جب بھی پہلے سے استعمال شدہ علامات اپنی جگہ بناتی ہیں تو تلازمات کے ذریعہ یا تو اپنے معانی تبدیل کر لیتی ہیں یا اپنے موجود معانی میں وسعت پیدا کر لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں بڑے شعراء میرؔ، دردؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، غالبؔ، اقبالؔ، یگانہؔ، فراقؔ، ناصرؔ، احمد مشتاقؔ وغیرہ ہم کے یہاں یہی رویّہ ملتا ہے۔ہمیں ناموں کا یہ سلسلہ احمد مشتاقؔ پر روکنا پڑا کہ علامات کے معاملے میں ہمارے ممدوح ذوالفقار عادل کا سلسلۂ نسب احمد مشتاق کے راستے غالبؔ و آتشؔ و مصحفیؔ و دردؔ سے جا ملتا ہے۔اپنے ان پیش رووٴں کے مانند ذوالفقار عادل کے ہاں بھی علامات کا استعمال مکمل فطری ہم آہنگی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ذوالفقار عادل کی شاعری کا تانا بانا، دریا، پانی، ہوا، نیند، خواب، درخت، پھول اور گھر جیسی کثیر المطالب علامات سے تشکیل پاتا ہے۔ان علامات و استعارات پر گفتگو الگ سے ایک مقالے کی متقاضی ہے۔

ہم نے ذوالفقار عادل کے زیرِ نظر مجموعہ کا ایک ہلکا پھلکا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ جائزہ ذوالفقار عادل کے قاری کو ایک راستا فراہم کر سکتا ہے۔ باقی شعر کی جملہ کیفیات سے حظ اٹھانا قاری کا حق بنتا ہے۔اس مجموعۂ کلام کی اشاعت قدرے تاخیر سے ہو رہی ہے لیکن اس کے تیور دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ابھی شاعر کے لاشعور کے نہاں خانوں میں بہت کچھ ہے جس کا مناسب وقت پر مناسب کیفیات و مشاہدات کے ساتھ آمیز ہو کر سامنے آنے کا انتظار جتنا ہمیں ہے، اُتنا خود شاعر کو بھی ہے۔ اُس کا لاشعور اُس کے لیے ایک ایسی الماری کا درجہ اختیار کر چکا ہے جس کی چابی اُس کے خیال میں اُسی الماری کے اندر ہے، دیکھیے یہ خزانہ کب باہر آئے :

اپنے آپ کو گالی دے کر، گھور رہا ہوں تالے کو
الماری میں بھول گیا ہوں پھر چابی الماری کی

نوید صادق

اپریل ۲۰۱۵ء

م۔محبت، ک۔کہانی

پہلا منظر: شجاع آباد

اناؤنسمنٹ ہوتی ہے ’’اور اب آ رہے ہیں ہمارے سکول کے ننھے منے شاعر۔‘‘

ساتویں جماعت کا ایک طالب علم، سینکڑوں بچوں اور بیسیوں اُستادوں کے سامنے سے گزرتا، لرزتا، کانپتا، سٹیج پر پہنچتا ہے۔ مائیک اُس کے قد کی مناسبت سے نیچے کیا جاتا ہے۔ استقبال کے لیے بجنے والی تالیاں رُک چکی ہیں۔ ہر طرف چھا جانے والی خاموشی طویل ہوتی جا رہی ہے۔

اُس کے ہونٹ لرزتے ہیں، آواز نہیں نکلتی۔ پہلا لفظ ادا کرنے کے لیے اسے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔ ہائی سکول میں منعقد یومِ پاکستان کی اس تقریب میں اسے ایک نظم سنانی ہے۔

سر زمینِ وطن، تُو مری جان ہے

پہلے مصرع کے بعد وہ آنکھیں کھولتا ہے اور ایک ہی سانس میں ساری نظم پڑھ جاتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں اور بجتی رہتی ہیں۔

فزکس کی کتاب سے ایک غزل پھسلتی ہے اور ناگہاں والدِ محترم کے قدموں میں جا گرتی ہے۔ والدِ محترم غزل اُٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔ اندھیرا چھا جاتا ہے، گرج چمک اور تیز بارش کی آوازیں۔ طبیعات کو مابعد الطبیعات پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

والدہ محترمہ گرج چمک کی افادیت سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتی ہیں کہ اُن کی

مداخلت تیز بارش کو ژالہ باری میں بدل سکتی ہے۔ بڑی ہمشیرہ رضا کارانہ طور پر سرچ آپریشن جاری رکھتی ہیں۔ کتابوں میں چُھپے اچھے شعر داد پاتے ہیں اور بُرے شعر۔۔۔۔۔۔۔۔ بُرے شعر، گرج چمک کے سپرد۔ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

چچا ولایت علی، لیاقت علی، دادا عیش محمد، ماموں شبیر، چاروں موزوں طبع، جب بھی آتے ہیں، محفل سج جاتی ہے۔ علامہ اقبالؔ کی خودی سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، پڑ دادا نذر محمد کی نعت گوئی سے ہوتا ہوا یہ سِلسِلہ کتابوں میں چھُپی غزلوں اور نظموں تک جا پہنچتا ہے۔ خودی بلند ہوتی ہے، ستارے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

شعر کو سمجھنے اور اچھا شعر کہنے کی دُھن، ظفر اقبال ظفرؔ کے پاس لے جاتی ہے۔ ملاقاتوں اور محفلوں کا سِلسِلہ استاد یٰسین خان ثاقبؔ، قمرؔ انصاری اور فتح محمد شاہدؔ سے لے کر شاکرؔ شجاع آبادی، سلیمؔ اختر قریشی اور منظور احمد منظورؔ تک پھیل جاتا ہے۔ چراغ جلنے لگتے ہیں، اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

کالج میں سائنس سوسائٹی کی سالانہ تقریب ہے۔ وہ ایک خاکہ لکھتا ہے۔ نیوٹن کا کردار خود ادا کرتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں۔ قوانینِ حرکت، تحریک بن جاتے ہیں۔ پھر ایک ڈرامہ، مرکزی کردار اور پھر تالیاں۔ تالیوں کی آوازیں والدِ محترم تک پہنچتی ہیں اور۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گرج چمک میں گم ہو جاتی ہیں۔ موسلا دھار، طوفانی بارش۔ سیلابی ریلے میں صرف پڑھائی باقی بچتی ہے۔ بلیک ہول جیسا اندھیرا۔

پھر ایک دن روشنی ہوتی ہے۔ ناقابلِ یقین حد تک تیز اور حیران کُن روشنی۔

والدِ محترم خود ایک نظم لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب انجینئرنگ یونیورسٹی میں اُس کا داخلہ ہو چکا ہے۔

بطور شاعر، یہ اُس کی زندگی کا پہلا دن ہے۔

دوسرا منظر: لاہور

دو بزرگ بیٹھے ہیں۔ ہر نوجوان سے کچھ سنتے جاتے ہیں، سر ہلاتے جاتے ہیں، کچھ

لکھتے جاتے ہیں۔ وہ تاخیر سے پہنچا ہے۔ اُس کی باری آتی ہے۔ وہ غزل سناتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔

یہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں لٹریری سوسائٹی کی ایک میٹنگ ہے۔ لریکل فورم کی بنیاد رکھی جارہی ہے اور یہ بزرگ، رحمٰن حفیظؔ اور ادریس بابرؔ ہیں۔

دروازہ کُھلتا ہے۔ حدِ نگاہ تک حیران کر دینے والی روشنی اُس کا استقبال کرتی ہے۔ ایک عجائب خانہ ہے۔ چراغ ہیں اور ستاروں کا کام کرتے ہیں، خواب ہیں اور چھوئے جا سکتے ہیں، بزرگ ہیں اور نوجوان دکھائی دیتے ہیں۔

وہ آگے بڑھتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑھتا کیا ہے، کھنچتا چلا جاتا ہے۔ رحمٰن حفیظؔ، ادریس بابرؔ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر طیّبؔ رضا، شاہینؔ عباس، توصیف خواجہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ آگے، نویدؔ صادق، اکبر ناصر خان، احمدؔ فاروق۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ اور آگے، غافرؔ شہزاد، منظر اعجاز منظرؔ، سمیرا طاہر سیمیؔ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عجائب خانے کے اندر ایک اور دروازہ کُھلتا ہے۔

وہ یہاں بھی تاخیر سے پہنچا ہے۔ ''راکھ'' کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ تمام فنکار سہمے ہوئے ہیں اور ایک بزرگ ہیں کہ کسی کی اداکاری سے مطمئن ہونے کے لیے تیار نہیں۔ یہ اِس کھیل کے ہدایتکار یونس ڈوگر ہیں۔ طیّبؔ رضا اور اکبر ناصر خان یہاں بھی موجود ہیں۔ ڈرامیٹک سوسائٹی کے لیے یہ کھیل طیّبؔ رضا نے لکھا ہے۔ امان اللہ خان کے ساتھ عبدالواحد خان اور اطہر غنی بھی سہمے ہوئے فنکاروں میں شامل ہیں۔

تمام کردار تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ اُس کے لیے بس یہی کام بچا ہے کہ سکرپٹ پکڑ کر پسِ پردہ بیٹھ جائے اور پرفارمنس کے دوران کرداروں کو اُن کے مکالمے یاد دلاتا رہے۔ وہ یہ کام اتنی دلجمعی سے کرتا ہے کہ اُسے سارا سکرپٹ حفظ ہو جاتا ہے۔

وہ اِس پورے منظر کو دیکھ کر اپنی طرف دیکھتا ہے۔ کچھ حسرتیں جو فوری طور سے اُس کے دل میں جگہ بناتی ہیں۔ کاش وہ ادریس بابرؔ جیسا شعر اور توصیف خواجہ جیسی نظم کہہ سکے اور طیّبؔ رضا جیسا ڈرامہ لکھ سکے۔

پھر وہ سب کرتا ہے جو طبعاً سست ہونے کے باوجود، وہ کر سکتا ہے۔ غزل، نظم، کہانیاں، سکرپٹ، مشاعرے، ورکشاپس، ڈرامے، سٹریٹ تھیٹر، خاکے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ

یہاں، یہ سب کرنے کے لیے آیا تھا۔؟ پسِ پردہ گرج چمک کروٹ لیتی ہے۔ وہ گرج چمک کو دعائیں دیتا ہے اور امتحانوں کے قریب صرف اور صرف پڑھائی پر توجہ دیتا ہے۔ یہی وہ دن ہیں جب وہ اپنے مہربان دوستوں اور کلاس فیلوز اعجاز احمد، عبدالواحد خان، اطہر غنی اور اظہر چوہدری کے آس پاس منڈلاتا نظر آتا ہے اور حیرت انگیز طور پر ایک بھی سپلی کا لطف اٹھانے سے محروم رہتا ہے۔

لاہور کا ایک دروازہ اِس عجائب خانے میں بھی کُھلتا ہے۔ باہر کے کچھ بزرگ یہاں بھی اپنا رنگ جماتے ہیں اور عجائب خانے کی رونق میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی، خالد احمد، ممتاز اطہر، فیصل عجمی، عباس تابش، سعود عثمانی، اختر عثمان۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نئے قافلے اُترتے ہیں۔ آصف علی قیصر، محمد ابوبکر، آصف شفیع، سلیم ساگر، محمود اعوان، عبدالرزاق ایزد، شاہد فرید۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوسری طرف نجم عباس نقوی، احسن اختر، نبیل بابری، ارسلان ارشد، شکیل رانا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور اِن کے بعد شعیب سلطان، شاہد جاوید، مرتضٰی حبیب، وقاص بن نجیب، سلمان بسرا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب ہیں تو نو واردان، لیکن لگتا ہے اپنی عمر سے دوگنا وقت کسی اور دنیا میں گزار کر آئے ہیں۔ یعنی جانے والے بھی بزرگ، آنے والے بھی۔

بزرگوں کو عجائب خانے سے الوداع کہتے ہوئے اُس کا دل دُکھ سے بھر جاتا ہے۔ ادریس بابر کے ناروے جانے پر تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اِتنا روتا ہے کہ عشق کے معنی سمجھ آنے لگتے ہیں۔ عنقریب اِس عجائب خانے سے رخصت ہونے کا احساس، اُسے بوڑھا کر دیتا ہے۔

بڑے بزرگوں میں اب شاہین عباس اور نوید صادق ہی رہ گئے ہیں، جو اُس کے شعر کہنے کا سبب ہیں اور چھوٹے بزرگوں کی ایک کابینہ، نجم، شعیب، شاہد، مرتضٰی، ہر بار اسے ایک ڈرامہ لکھنے پر راضی کر لیتی ہے۔

ایک اور دروازہ کُھلتا ہے، اجو کا تھیٹر۔ یہ ایک اور دنیا ہے۔ انتظار حسین اور شاہد ندیم کے ساتھ چند نشستیں، اس کے اندر کہانیوں کا طوفان لے آتی ہیں۔ وہ کچھ ایسی کہانیاں بھی

ترتیب دیتا ہے جو کبھی نہیں لکھی گئیں اور ایسے سکرپٹ بھی لکھ ڈالتا ہے جو کہیں پرفارم نہیں ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔

تیسرا منظر: فاضل پور

وہ موبائل فون ہاتھ میں لیے، میدان میں اِدھر سے اُدھر بھاگتا پھر رہا ہے۔ کٹ کٹ کر آنے والی ایک آواز کو اُس تک پہنچنے کے لیے سگنلز کی ضرورت ہے۔ وہ آواز جو فاضل پور کی تنہائی میں اُس کے اندر کے شاعر کو زندہ رکھتی ہے۔ وہ آواز، جس نے اُس کی آواز کو بے شمار سماعتوں تک پہنچا دیا ہے۔ یہ شاہینؔ عباس کی آواز ہے اور یہ سگنلز صرف موبائل فون تک کا معاملہ نہیں ہیں۔

شاہین عباس کی مہربان آواز کچھ اور آوازوں کو راہ دیتی ہے۔ اکبر معصومؔ، شناور اِسحاق، انعام ندیمؔ، کاشف حسین غائرؔ، شاہدؔ ذکی، احمدؔ رضوان، افضل گوہرؔ۔۔۔۔۔۔۔ سگنلز بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔

چھٹیوں کے دوران چار صفحوں کی ایک نظم اُس کے سامنے سے گزرتی ہے اور اُسے حیران کر دیتی ہے۔ یہ وقار احسنؔ ہے، جو اچانک اُس کے سامنے ایک شاعر کی حیثیت سے آ کھڑا ہوا ہے۔ وقار احسن نظمیں کتابوں میں نہیں چُھپاتا، والدِ محترم بے خبر ہیں۔ وہ کم گرج اور زیادہ چمک کے ساتھ والدِ محترم کے فرائض خود انجام دیتا ہے۔ وقار کم از کم یہ سمجھ گیا ہے کہ اچھی نظمیں چار صفحوں سے کم پر بھی لکھی جا سکتی ہیں۔

اُس کے شعروں کا براہِ راست اور پہلا نشانہ بننے والی اُس کی اہلیہ، جسے ہمیشہ یہ گِلہ رہتا ہے کہ اُس نے اُس کے لیے کبھی کچھ نہیں لکھا، عجیب داد دیتی ہے۔ وہ اُس کے شعر سُن کر اُسی زمین میں خود شعر کہنا شروع کر دیتی ہے۔اب یہ اُس کے موڈ پر ہے، اچھا ہے تو اچھے اور سنجیدہ شعر، بُرا ہے تو بُرے اور مزاحیہ شعر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''اِک کمرا سایوں سے بھرا ہے، اِک کمرا آوازوں سے''

وہ یہ مصرع اپنی اہلیہ سے تحفتاً قبول کرتا ہے اور دوسرا مصرع کہہ کر یہ شعر اپنی اہلیہ کی

ہی نذر کر دیتا ہے۔

"آنگن میں کچھ خواب پڑے ہیں، ویسے یہ گھر خالی ہے"

محمود کوٹ میں اہلیہ کے بعد اُس کے واحد با قاعدہ سامع منظور قریشی ہیں جو کافکاؔ کے ایک ناول کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔شجاع الدین احمد، عطا اللہ اور عمیر پیرزادہ سے ملاقات اور اُن کی جانب سے پذیرائی ہمیشہ تحریک کا سبب بنتی ہے۔

چوتھا منظر: کراچی

دیر ہو چکی ہے۔ لانڈھی نمبر ٦ کا سٹاپ، پٹھان کا ہوٹل، یہی طے ہے،لیکن بہت دیر ہو چکی ہے، ہمیشہ کی طرح۔ یہ کاشف حسین غائرؔ سے اُس کی پہلی ملاقات ہے۔اُس کی شرمندگی کئی گُنا بڑھ جاتی ہے، جب وہ کاشف غائرؔ کے ساتھ اجملؔ سراج کو بھی اپنا منتظر پاتا ہے۔

کاشف حسین غائرؔ سے چند ملاقاتوں کے بعد اُسے لگتا ہے کہ یہ دوسرے منظر کا کردار ہے جو چوتھے منظر میں نمودار ہوا ہے۔عمر میں کم اور بزرگی میں بہت آ گے۔

اِس کے بعد کی سب ملاقاتیں اور محفلیں ،کاشف حسین غائرؔ کی وجہ سے ہی ممکن ہوتی ہیں۔ رساؔ چغتائی،آصف فرخی،محسنؔ اسرار، احمد صغیر صدیقی، فراستؔ رضوی، صابِر وسیم، شاہنوازؔ فاروقی،سیما غزلؔ،سائرہ غلام نبی،فہیم شناسؔ کاظمی،سحرتابؔ رومانی،سلمان خواجہ،کاشف رضا، انعام ندیمؔ، رفاقت حیات، خالد معین............

کاشف ،پہلے منظر کے ایک بزرگ مقبولؔ عابدی کو بھی اُس کے لیے ڈھونڈ نکالتا ہے۔مقبولؔ عابدی، استاد یٰسین خان ثاقبؔ کے قریبی دوستوں میں شامِل ہیں۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد مقبولؔ عابدی کے انتقال کی خبر، دِل ہِلا کر رکھ دیتی ہے۔

کتاب کے لیے دوستوں کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ کاشف حسین غائرؔ تو کتابت تک کروا لاتا ہے۔

کتاب کے نام کا فیصلہ وہ اُن دو بزرگوں پر چھوڑتا ہے جو اُس کے لیے خدا کی سب

سے بڑی نعمت ہیں، اُس کے والدین۔۔۔۔(خدا اُن کا سایہ ہمیشہ سلامت رکھے)۔

وہ جانتا ہے کہ کسی بھی شاعر کی پہلی کتاب، اُس کی آخری کتاب بھی ہو سکتی ہے، پھر کہانیاں بھی اُسے کھینچتی ہیں، ڈراما بھی۔ اُس کا شعری سفر دوستوں اور بزرگوں کے ناموں کی طویل فہرِست کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سب سے اپنی کتاب پر کچھ نہ کچھ لکھوانا چاہتا ہے، لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آج بھی وہ ساتوِیں جماعت کا طالبِ علم ہے۔ اُس کے ہونٹ لرزتے ہیں، آواز نہیں نکلتی۔ تاہم پہلا لفظ ادا کرنے کے لیے اب اُسے اپنی آنکھیں بند نہیں کرنا پڑتیں۔

اچھا شعر کہنے کی حسرت، اُس کے دِل میں آج بھی موجود ہے۔ پانچواں منظر کیا ہو گا، کون جانتا ہے؟؟؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ذوالفقار عادلؔ

بیٹھے بیٹھے پھینک دیا ہے آتش دان میں کیا کیا کچھ
موسم اِتنا سرد نہیں تھا جتنی آگ جلا لی ہے